ذی الحجہ، محرم

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

اگست 2021

ماہ نامہ

ذوق و شوق

کراچی

پاکستان زندہ باد

سال نامہ

نیا ہجری سال ۱۴۴۳ھ مبارک

J.

FRAGRANCES

POUR FEMME

An elusive fragrance, J. Pour Femme reflects the persona and charisma of a woman who is determined and self reliant. It is the best pick of this summer, for those who value their uniqueness and individuality.

Available on the App Store

GET IT ON Google Play

Shop online at www.junaidjamshed.com J.Fragrances J.JunaidJamshed FragrancesJ J.Fragrances

YoungsFood
Young's
Success Ka Secret
Maa Ke Haath Ka Pyaar Aur...
Young's
Chicken Spread
يونغز دجاج قابلة للدهن
Power of 5
Real Chicken Chunks
200ml
Young's
Chicken Spread
Bar-B-Que
يونغز دجاج قابلة للدهن
باربي كيو
ALSO AVAILABLE IN BBQ FLAVOUR
Full Nutrition, Complete Meal!

Shangrila
THE FOOD EXPERTS!
IMLI GINGER SAUCE
BAR-B-Q SAUCE
GREEN CHILLI SAUCE
GARLIC CHILLI SAUCE
SHANGRILA KETCHUP AND SAUCES
TASTY!
DELICIOUS!
KHAANON KAY
MUST HAVES!
Shangrila
TOMATO KETCHUP
Real Tomatoes
SMART PACK
Tantalize your taste buds
Shangrila
TOMATO KETCHUP
Tantalize your taste buds
600g
21.16 oz
www.shangrila.com.pk
shangrilaPakistan
ShangrilaPakistan

پیغامِ الٰہی جل جلالہ

عبدالعزیز

(مفہوم آیات: 91، 92، از سورہ بقرہ)

''اور جب ان یہودیوں سے کہا جاتا ہے کہ تم ان تمام کتابوں پر ایمان لاؤ جو اللہ تعالیٰ نے مختلف نبیوں پر نازل فرمائی ہیں (جن میں قرآن کریم بھی شامل ہے) تو (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم (توصرف) اسی کتاب (تورات) پر ایمان لائیں گے جو (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے) ہم (لوگوں) پر نازل کی گئی ہے اور (باقی) جتنی کتابیں (انجیل اور قرآن کریم) اس کے علاوہ ہیں، ان (سب) کا انکار کرتے ہیں، حالاں کہ وہ (کتابیں) بھی برحق ہیں اور اُن کے پاس جو کتاب (تورات) ہے، اسے سچا بتانے والی بھی ہیں۔ آپ کہیے کہ اگر تم (تورات پر) ایمان رکھنے والے تھے (تو) پھر اس سے پہلے زمانے میں اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے تھے۔ اور (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) تم لوگوں کے پاس (توحید اور رسالت کی) صاف صاف دلیلیں لائے، (مگر) تم لوگوں نے اس پر بھی (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) کے (طور پہاڑ پر جانے کے) بعد بچھڑے کو (معبود) بنالیا اور تم لوگ (اس عمل میں) ظلم کرنے والے ہو۔''

عزیز دوستو! ان آیتوں میں یہودیوں کی مزید بُری صفات کا ذکر کیا گیا ہے:

پہلی بُری صفت یہ کہ یہودی لوگ قرآن کریم اور انجیل کے سچا اور برحق ہونے کے باوجود اُن پر صرف اس لیے ایمان نہیں لاتے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل نہیں ہوئیں، جب کہ یہ کتابیں ان کی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والی، یعنی اسے سچا بتانے والی ہیں۔ دوسری بُری صفت یہ کہ ان کے گروہ کے لوگوں نے انبیائے کرام علیہم السلام کو نعوذ باللہ شہید کیا، جب کہ نبیوں کو قتل کرنا تورات سمیت تمام آسمانی کتابوں کی تعلیمات کے لحاظ سے کفر ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے کہلوایا کہ اگر تم ایمان والے ہو تو تمھارے گروہ کے لوگوں نے نبیوں کو قتل کیوں کیا؟ جب کہ نبیوں کو قتل کرنا ہر آسمانی کتاب کی رو سے کفر ہے اور تورات کی بھی یہی تعلیم ہے اور تمھارا حال تو اتنا بُرا ہے کہ تم نبیوں کو قتل کرنے والے لوگوں کو اپنا پیشوا مانتے ہو۔ تیسری بُری صفت یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے دیکھنے کے باوجود اُن کے طور پہاڑ پر جاتے ہی ان لوگوں نے گائے کے بچھڑے کو نعوذ باللہ اپنا خدا بنالیا۔ ان کا یہ عمل بھی ظلم ہے، بل کہ کفر ہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہودیوں نے اپنی کتاب تورات کے علاوہ دوسری کتابوں، انجیل اور قرآن کریم کا انکار کیا، انبیائے کرام علیہم السلام کو شہید کیا، بچھڑے کو اپنا معبود بنایا۔ یہ تمام باتیں کفریہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان یہودیوں کی طرح ایمان کا دعویٰ کر کے کفر و شرک کرنے سے ہم تمام مسلمانوں کی حفاظت فرمائے! آمین یارب العالمین!

پیغامِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

اشد علی نواب شاہی

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کلمات کے ذریعے رخصت فرمایا کرتے تھے:

اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَاَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ

(ترمذی، ۳۴۴۳)

عزیز ساتھیو!

کبھی ہم کسی کے ہاں مہمان ہوتے ہیں اور کبھی ہمارے ہاں کوئی مہمان بن کر آتا ہے۔ کبھی گھر سے کسی کو سفر پر جانا ہوتا ہے۔ ابو تجارت کے لیے دوسرے شہر یا دوسرے ملک جاتے ہیں۔ کبھی والدین، رشتے دار یا کوئی اور دوست احباب حج یا عمرے کے لیے جارہے ہوتے ہیں تو ہم انھیں اس مبارک دعا کے ذریعے رخصت کریں۔

عام طور سے یہ دعا دینا ہم بھول جاتے ہیں اور بعض لوگوں کو یہ دعا یاد ہی نہیں ہے، لہٰذا اگر ہمیں یہ دعا یاد نہیں ہے تو اِسے یاد کرلیں اور اگر یاد ہے تو یاد دہانی سے کسی کو رخصت کرتے ہوئے یہ دعا ضرور دیں۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا ثواب بھی ملے گا اور رخصت ہونے والے کو اچھے انداز سے دعاؤں کے ساتھ رخصت کریں گے۔ اس دعا کا ترجمہ یہ ہے:

''میں تمھارے دین، تمھاری امانت اور تمھارے اعمال کے انجام کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہوں۔''

ترجمے سے اندازہ کیجیے کہ کتنے مبارک کلمات سے دعا دی جارہی ہے۔ سفر میں کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کیا ہو جائے تو اللہ سے ساری بھلائیوں کی دعا مانگی جارہی ہے۔

عزیز ساتھیو!

چلیے، بسم اللہ کیجیے! یہ دعا یاد کیجیے اور دوسروں کو بھی یاد کروایئے اور اَلوداع کرتے ہوئے یہ دعا ضرور دیجیے!

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ (حمد) — اثر جون پوری — 6

وہی مجتبیٰ ہیں (نعت) — ارسلان اللہ خان — 6

سیرت کہانی ⑫ — عبدالعزیز — 7

بلاعنوان (۱۶۸) — ڈاکٹر عمران مشتاق — 10

آزادی کا سورج ❶ — ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی — 15

منکی الیون — محمد فیصل علی — 20

پیارا اپنا پاکستان (نظم) — امان اللہ نیّر شوکت — 25

قرض — انسپکٹر احمد عدنان طارق — 26

جادو کا چراغ — تنزیلہ احمد — 30

فاتح کون (۲) ❶ — نذیر انبالوی — 36

محرم الحرام اور صوم یوم عاشورہ — وردہ صدیقی — 39

یہ پیارا سال نامہ ہے (نظم) — انصار احمد معروفی — 40

14 اگست کے بعد — مریم شہزاد — 41

بہار آگئی! — مفتی محمد معاویہ اسماعیل — 42

انوکھا خیال — حافظ محمد شائل بن کامران — 47

وطن کا بٹوارا — بیگم ناجیہ شعیب احمد — 49

قیمت آزادی — عالیہ ذوالقرنین — 54

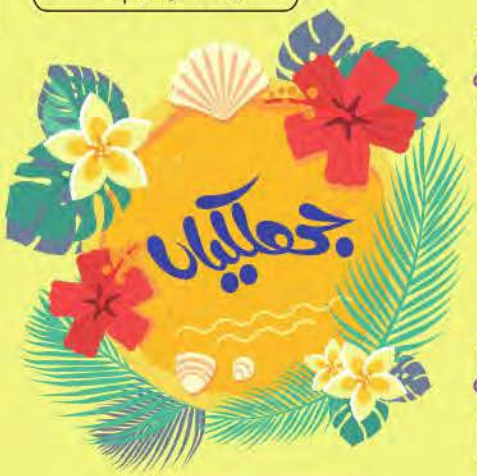

ایجاد کی چوری — محمد ایوب — 57

یہ ہے میرا وطن (نظم) — محمد شریف شیوہؔ — 62

آن لائن بیستی — راحت عائشہ — 63

بیس سال بعد — ن۔ش۔خان — 67

پبلشر محمد عارف رشید نے بچوں کی تعلیم و تربیت، ترقی و اصلاح کی خاطر ان حسین پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

ماہ نامہ

ذوق و شوق

کراچی

زیر سرپرستی:

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

ذی الحجہ، محرم ۱۴۴۳ ہجری | جلد: 16

شمارہ: 08

ناشر: محمد عارف رشید

مجلس ادارت

■ مدیر: عبدالعزیز

■ معاون: محمد طلحہ شاہین

سرورق السٹریٹر: سید ناصر

آرٹسٹ: قیصر شریف

کمپوزر: سعد علی

نگران ترسیل: منور عمر

اس رسالے کی تمام آمدنی تعلیم و تبلیغ اور اصلاح امت کے لیے وقف ہے۔

قیمت 80

سالانہ خریداری بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک 1000/=

بذریعہ عام ڈاک 750/=

ماہ نامہ ذوق و شوق میں اشتہار شائع کرنے کا مطلب تصدیق ہے نہ سفارش۔ یہ صرف عوام کو مطلع کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مصنوعات کے بارے میں قارئین خود تحقیق فرمالیں۔

خط و کتابت کا پتہ:

ماہ نامہ ذوق و شوق، پی۔او۔بکس نمبر 17984 پوسٹ کوڈ 75300 گلشن اقبال، کراچی

Email: zouqshouq@hotmail.com

zouq shouq/ذوق شوق

اشتہارات اور سالانہ خریداری کے لیے رابطہ کریں

0213-4990760, 0341-4410118

What's app: 0324-2028753

دفتری اوقات: صبح 8:00 تا 1:00 دوپہر 2:30 تا 6:00

PARADISE BOOKS DISTRIBUTORS

Karachi: J-73, UNIT-1, GROUND FLOOR, OFF ALLAMA IQBAL ROAD, PECHS BLOCK-2, KARACHI. 021-34314981
LAHORE: SIDDIQUE MANAZIL, 2ND FLOOR, 40-ABBOT ROAD, STREET NEON PRINCE , LAHORE. 051-48430042
RAWALPINDI: OFFICE NO 2, FIRST FLOOR, STAR PLAZA, PARADISE HOUSE, RAWALPINDI. 042-3629701

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر اَدا کیا جائے کم ہے! کیوں کہ بات ہی کچھ ایسی ہے! بل کہ اللہ تعالیٰ نے نعمت ہی کچھ ایسی عطا فرمائی ہے! بُوجھ لیا ہوگا آپ نے؟ کیا کہا؟ نہیں! کمال ہے! چلیے اندازہ ہی لگا لیجیے کہ ہم کس نعمت کی بات کر رہے ہیں!

''ملتانی آم!'' بہت میٹھی نعمت ہے، لیکن جناب! ہماری مراد یہ نہیں ہے۔

''پشاوری چپل!'' بہت مضبوط نعمت ہے، کھا کر دیکھ لیجیے، لیکن ہماری مراد یہ بھی نہیں ہے۔

''شکار پوری اچار!'' بہت کھٹی نعمت ہے! نام سنتے ہی منھ میں پانی آ گیا، لیکن ہماری مراد یہ بھی نہیں ہے۔

کیا کہا! ہم خود ہی بتا دیں۔ چلیے، ہم ایک اشارہ کر دیتے ہیں، شاید آپ اس کے ذریعے بُوجھ لیں۔ وہ اشارہ ہے ماہ اگست۔

ارے ارے ارے! اتنا خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں پتا تھا کہ آپ یہ اشارہ ملتے ہی ہماری مراد تک پہنچ جائیں گے!

جی ہاں، ہم بات کر رہے ہیں آزادی کی نعمت کی! آزادی اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت ہے جو ہزاروں نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔

مثال کے طور پر آپ تصور کیجیے کہ بقرہ عید کا پہلا دن ہے، آپ کے محلے میں گائے ذبح کی جا رہی ہے، آپ اپنی گیلری سے یہ منظر دیکھ رہے ہیں کہ اتنے میں جوانوں کا ایک جتھا آ کر قربانی کرنے والے مسلمانوں پر دھاوا بول دیتا ہے اور انھیں مارنا شروع کر دیتا ہے، صرف اس بات پر کہ تم ہماری ماں کو کیوں ذبح کر رہے ہو؟! اسی طرح آپ سوچیں کہ آپ جمعے کی تیاری کر کے مسجد کی طرف جا رہے ہیں اور راستے میں آپ کو چند سپاہی روک لیتے ہیں کہ واپس جاؤ، گھر پر نماز پڑھو، مسجد میں نماز پڑھنے کی اب اجازت نہیں ہے!

اللہ نہ کرے کہ اگر ایسا ہو تو آپ کو کیسا لگے گا؟ دنیا کے مختلف ملکوں میں یہ صورت حال ہے، الحمدللہ ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہے، اس لیے کہ ہم ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں! آزادی ہی کی وجہ سے ہم یہاں اللہ و رسول کے حکموں کو مرضی اور خوشی سے پورا کر پاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں آزادی کی نعمت کی قدر کرتے ہوئے اللہ و رسول کی اطاعت میں پوری طرح سے لگنا چاہیے۔ نہ صرف خود لگنا چاہیے، بل کہ اوروں کو بھی لگانا چاہیے۔

ہم ایک وضاحت یہاں یہ بھی کر دیں کہ بعض لوگ آزادی کا مطلب اللہ اور رسول کے حکموں اور سنتوں سے آزادی سمجھتے ہیں، جب کہ آزادی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ اس آزادی کے حصول کے لیے دی گئی قربانیوں پر پانی پھیر رہا ہے، کیوں کہ وہ قربانیاں آزادی سے اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرنے کے لیے ہی دی گئی تھیں، تبھی تو یہ نعرہ اُس وقت بچے بچے کی زبان پر تھا: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ!'' امید ہے آپ ہماری بات سمجھ گئے ہوں گے! اگر نہیں بھی سمجھے تو اپنے کسی بڑے سے سمجھ لیجیے گا۔

ارے ایک اور نعمت بھی تو ملی ہے اسی ماہ اگست میں! جی، صحیح پہچانا! ماہ نامہ ذوق وشوق کا سال نامہ! چلیے، ہم بھی ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، آپ بھی کیجیے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

اثر جون پوری۔ کراچی

میری زباں پر ہو اکثر ، لَااِلٰہَ اِلَّا اللہ
ہونٹ رہیں تہلیل سے تر ، لَااِلٰہَ اِلَّا اللہ

قلب میں لے کر تیرا ڈر ، بند کروں میں آنکھیں گر
کھل جائے گا تیرا در ، لَااِلٰہَ اِلَّا اللہ

تیرے ہی گُن گاؤں میں ، جب دنیا سے جاؤں میں
کلمۂ طیب ہو لب پر ، لَااِلٰہَ اِلَّا اللہ

اے خلّاقِ بحر و بر ! ہے یہ تمنا تا محشر
میرا سر ہو تیرا در ، لَااِلٰہَ اِلَّا اللہ

تو دیکھے باریکی میں ، راتوں کی تاریکی میں
تو ہی بخشے نورِ سحر ، لَااِلٰہَ اِلَّا اللہ

ذکر بنا آرام نہ ہو ، اس کے سوا کچھ کام نہ ہو
جپتا رہوں میں جیون بھر ، لَااِلٰہَ اِلَّا اللہ

میرا دل تیرا مسکن ، میری آنکھیں ہیں روشن
جب سے دیکھا تیرا گھر ، لَااِلٰہَ اِلَّا اللہ

مشکل الفاظ کے معانی

تہلیل: لا الہ الا اللہ کہنا
خلّاق: اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام۔ خالق
نورِ سحر: صبح کی روشنی

وہی مجتبیٰ ہیں

ارسلان اللہ خان۔ حیدرآباد

وہی مصطفیٰ ہیں ، وہی مجتبیٰ ہیں
وہ شمس ُالضحیٰ ہیں ، وہ بدرُ الدجیٰ ہیں

خدا ہی کو معلوم ہے ان کی عظمت
خدا ہی فقط جانتا ہے وہ کیا ہیں

وہی تو ہیں سردار کل انبیا کے
وہ خیر ُالبشر ہیں ، وہ خیر ُالوریٰ ہیں

محبت ، امانت ، وفا اور صداقت
محمد ہمارے سراپا عطا ہیں

وہی ہیں فقط ایک انسانِ کامل
وہی مقتدا ہیں ، وہی پیشوا ہیں

وہ معراج کی شب گئے لامکاں تک
وہی واقف سدرۃُ المنتہیٰ ہیں

وہی صاحبِ قابَ قوسین ہیں اور
وہ صدرُ العلیٰ ہیں ، وہ نور الہدیٰ ہیں

کروں ارسلاں! کیسے مدحت نبی کی
وہ محبوبِ رب ہیں ، رسولِ خدا ہیں

مشکل الفاظ کے معانی

شمس الضحیٰ: چاشت کے وقت کا سورج۔ آب وتاب والا سورج
بدرالدجیٰ: اندھیرے کا چاند۔ چودھویں کا چاند
خیرالبشر: سب سے بہتر انسان
خیرالوریٰ: تمام مخلوقات میں سب سے بہتر اور افضل
سراپا: مکمل۔ پورا
لامکاں: عالم قدس جس کی جانب اور جگہ معین نہیں
سدرۃ المنتہیٰ: ساتویں آسمان پر بیری کا بہت بلند درخت۔
قاب قوسین: نہایت قرب
نورالہدیٰ: ہدایت کی روشنی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کرنا اتنا عظیم الشان عمل تھا کہ اسلامی تاریخ کی ابتدا بھی ہجرت ہی سے شروع کی گئی، اسی لیے ہم اسے ہجری سن ہی کہتے ہیں۔

ہوا یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ آپ کے خطوط ہمارے پاس پہنچتے ہیں، لیکن ان پر تاریخ نہیں ہوتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۱۷ ہجری میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تاریخ متعین کرنے کے بارے میں مشورے کے لیے بلایا۔

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ کہا کہ تاریخ کی ابتدا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملنے کے وقت سے ہونی چاہیے۔ بعض نے کہا: ہجرت سے اور بعض نے مشورہ دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے اسلامی تاریخ کی ابتدا کی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''تاریخ کی ابتدا ہجرت سے ہونی چاہیے، اس لیے کہ ہجرت ہی سے حق اور باطل میں فرق قائم ہوا ہے اور ہجرت ہی سے اسلام کی عزت اور غلبے کی ابتدا ہوئی ہے۔''

سب نے اس رائے کو پسند کیا۔ اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ سن ہجری کی ابتدا ربیع الاوّل سے ہوتی، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی ماہ میں مدینہ منورہ پہنچے تھے، لیکن بجائے ربیع الاول کے محرم سے ہجری اور اسلامی تاریخ کی ابتدا اِس لیے کی گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کا ارادہ محرم ہی سے فرما چکے تھے۔

انصار نے ذی الحجہ کے ابتدائی عشرے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی اور ذی الحجہ کے آخر میں انصار، حج کر کے مدینہ منورہ واپس ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی واپسی کے چند روز بعد ہی ہجرت کا ارادہ فرمایا اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہجرت کی اجازت دی، اس لیے سال ہجری کی ابتدا محرم الحرام سے کی گئی۔

حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہی مشورہ دیا کہ سن ہجری کی ابتدا محرم الحرام سے ہونی چاہیے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ رمضان المبارک سے ابتدا ہونی چاہیے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''محرم الحرام ہی مناسب ہے، اس لیے کہ لوگ حج سے بھی محرم ہی میں واپس ہوتے ہیں۔''

بالآخر اِسی پر سب کا اتفاق ہو گیا۔

(فتح الباری، باب التاریخ، ج:۷، ص:۲۰۹)

شرح السیر الکبیر میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تاریخ کی ابتدا کے حوالے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مشورے کے لیے جمع کیا تو بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ مشورہ دیا کہ تاریخ کی ابتدا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے ہونی چاہیے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس رائے کو پسند نہیں فرمایا، اس لیے کہ اس میں عیسائیوں کے ساتھ مشابہت تھی کہ ان کی تاریخ (شمسی تاریخ) کی ابتدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ہوئی ہے۔

بعض حضرات نے یہ رائے دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تاریخ کی ابتدا کرنی چاہیے۔ اسے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پسند نہیں فرمایا، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ایک عظیم حادثہ تھا، اس سے اسلامی تاریخ کی ابتدا مناسب نہیں۔ مشورے کے بعد سب کا اتفاق اس پر ہو گیا کہ ہجرت سے اسلامی تاریخ کی ابتدا ہونی چاہیے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی رائے کو پسند کیا، اس لیے کہ ہجرت ہی سے حق اور باطل کا فرق واضح ہوا۔ جمعہ اور عید کی نمازیں ہجرت ہی کے

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی اور سیرت کے اہم واقعات پر مبنی ایک پیارا سلسلہ۔

سیرت کہانی

۲۷

عبدالعزیز

بعد کھلم کھلا ادا کی گئیں۔

(شرح السیر الکبیر، ج:۴، ص:۴۳۴)

آپ ﷺ جب مدینہ منورہ پہنچے تو یہودیوں کے علما خاص طور پر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے امتحان لینے کے طور پر مختلف قسم کے سوالات کیے، اس لیے کہ یہودی علما کو پچھلے انبیائے کرام علیہم السلام کی بشارتوں سے آخری نبی کے ظاہر ہونے کا اچھی طرح علم تھا اور وہ یہ جانتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جس نبی کے ظاہر ہونے کی خوش خبری دی ہے وہ عن قریب بطحا کی وادی میں ظاہر ہونے والے ہیں اور وہ آپ کے آنے کے منتظر تھے، اسی لیے تو جب پہلی مرتبہ حضور ﷺ نے انصار کے سامنے اسلام پیش کیا تو اُنھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا کہ یہ وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کے ظاہر ہونے کا یہودی ذکر کرتے ہیں، ہمیں ان پر ایمان لے آنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ یہودی اس سعادت میں ہم سے آگے نکل جائیں۔

(البدایہ والنہایہ، ج:۳، ص:۱۴۸)

جس کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کی سعادت لکھ دی تھی، وہ آپ ﷺ کو دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ وہی نبی برحق ہیں جن کی پچھلے انبیا علیہم السلام نے خوش خبری دی ہے اور اُس نے بغیر کسی شک وشبہے کے ایمان قبول کرلیا۔

یہودی علما میں سے سب سے پہلے آپ ﷺ کی خدمت میں یاسر بن اخطب حاضر ہوا، جو حیی بن اخطب کا بھائی تھا۔ اس نے آپ ﷺ کا کلام سنا اور واپس جا کر اپنی قوم سے کہا:

''میرا کہا مانو، یہ وہی نبی ہیں جن کے تم منتظر تھے، وہ آگئے ہیں، لہٰذا ان پر ایمان لے آؤ۔''

لیکن اس کے بھائی حیی بن اخطب نے اس کی مخالفت کی۔ وہ قوم میں بڑا اور سردار مانا جاتا تھا، قوم اسی کی اطاعت کرتی تھی، لہٰذا قوم نے اسی کی اطاعت کی اور اُسی کا کہا مانا اور یاسر کی بات نہ سنی۔

(فتح الباری، ج:۷، ص:۲۱۳)

جب آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہودی علما اپنے مدرسے بیت المدراس میں جمع ہوئے اور مشورہ کیا کہ اس شخص (آپ ﷺ) کے پاس جا کر سوالات کرنے چاہییں۔

(فتح الباری، ج:۷، ص:۲۱۴)

ایک یہودی عالم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایسے وقت پہنچا کہ اس وقت آپ ﷺ سورۂ یوسف کی تلاوت فرمارہے تھے۔ اس نے پوچھا:

''محمد! یہ سورت آپ کو کس نے سکھائی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی تعلیم دی ہے۔''

اسے بہت تعجب ہوا۔ اس نے واپس جا کر یہودیوں سے کہا:

''محمد جو قرآن پڑھتے ہیں وہ ایسی ہی کتاب لگتی ہے جیسی تورات، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔''

پھر یہودیوں کی ایک جماعت کو اپنے ساتھ آپ کی خدمت میں لایا۔ ان لوگوں نے آپ کی صورت اور صفت کو دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ وہی نبی ہیں جن کی آمد کی تورات میں خبر دی گئی ہے۔ آپ ﷺ کے دونوں شانوں کے درمیان نبوت کی مہر بھی دیکھی اور آپ ﷺ جو سورۂ یوسف تلاوت فرمارہے تھے، اسے بھی غور سے سنا۔ سن کر حیران رہ گئے اور سب کے سب اسلام لے آئے۔

(فتح الباری، ج:۷، ص:۲۱۴)

اسی طرح اور بہت سے علمائے یہود آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اِسلام لے آئے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تورات کے بڑے زبردست عالم تھے۔ آپ حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کا اصل نام حصین تھا۔ اسلام لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن سلام نام رکھا۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اپنے اسلام لانے کا واقعہ خود بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو میں آپ کے آنے کی خبر سنتے ہی آپ کو دیکھنے کے لیے حاضر ہوا۔ آپ کے چہرۂ انور کو دیکھتے ہی میں جان گیا کہ یہ جھوٹے شخص کا چہرہ نہیں ہے۔ پہلا کلام جو میں نے آپ ﷺ کی زبان سے سنا وہ یہ تھا: 'اے لوگو! دوسروں کو کھانا کھلاؤ، آپس میں سلام پھیلاؤ، صلہ رحمی کرو اور رات کو نماز پڑھو جب لوگ سو رہے ہوں تو تم جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہوجاؤ گے۔'

میں رسول اللہ ﷺ کا نام، آپ کی صفت اور آپ کا حلیہ پہلے ہی سے جانتا تھا، مگر کسی سے ظاہر نہیں کرتا تھا۔ جب آپ ﷺ مدینے تشریف لائے اور میں نے آپ کی خبر سنی تو میں اس وقت ایک کھجور کے درخت پر چڑھا ہوا تھا۔ وہیں خوشی سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ میری پھوپھی خالدہ بنت حارث نے کہا:

'اگر تم موسیٰ علیہ السلام کی خبر سنتے تو اِس سے زیادہ خوش نہ ہوتے؟'

میں نے کہا: 'خدا کی قسم! یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہیں۔ وہی دین دے کر بھیجے گئے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام دے کر بھیجے گئے تھے۔'

میری پھوپھی نے کہا: 'اے میرے بھتیجے! کیا یہ وہی نبی ہیں جن کی ہم خبریں سنتے ہیں کہ قیامت کی سانس (فتنوں) کے ساتھ ظاہر ہوں گے؟'

میں نے کہا: 'ہاں، یہ وہی نبی ہیں۔'

پھر میں گھر سے نکل کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اِسلام لے آیا۔ واپس آ کر اپنے تمام گھر والوں کو اِسلام کی دعوت دی تو وہ سب بھی اسلام لے آئے۔ اس کے بعد میں نے آپ ﷺ سے عرض کیا:

'یارسول اللہ! اس سے پہلے کہ میری قوم کو میرے اسلام لانے کا علم ہو، آپ مجھے کسی کوٹھڑی میں بٹھلا کر یہودیوں سے میرے بارے میں دریافت کیجیے، کیوں کہ یہودی بڑی بہتان باندھنے والی قوم ہے۔''

چناں چہ جب یہودی آپ ﷺ کی خدمت میں آئے تو آپ ﷺ نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو کوٹھڑی میں بٹھا کر یہودیوں سے کہا:

''اے یہودیو! اللہ سے ڈرو، قسم ہے اس ذات کی جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں! تم جانتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور حق لے کر آیا ہوں، لہٰذا اِسلام لے آؤ۔'' یہودیوں نے کہا:

''ہم نہیں جانتے۔''

آپ نے تین بار یہی بات دہرائی۔ یہودی ہر بار یہی کہتے رہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے دریافت فرمایا:

''عبداللہ بن سلام تم میں کیسا شخص ہے؟'' انھوں نے کہا:

''ہمارا سردار اور ہمارے سردار کا بیٹا ہے۔ ہمارا سب سے بڑا عالم اور سب سے بڑے عالم کا بیٹا ہے اور ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کا بیٹا ہے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''اگر عبداللہ بن سلام مجھ پر ایمان لے آئے تو پھر تم میرے سچے نبی ہونے کا یقین کرو گے؟'' یہودی کہنے لگے:

''عبداللہ بن سلام کبھی اسلام لا ہی نہیں سکتا۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''بالفرض اگر وہ اسلام لے آئے؟'' یہودیوں نے کہا:

''ہو ہی نہیں سکتا، وہ کبھی مسلمان نہیں ہوگا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے ابن سلام! باہر نکل آؤ۔''

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے باہر آ گئے اور یہودیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

''یہودیو! خدا سے ڈرو۔ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں! تم خوب جانتے ہو کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور حق لے کر آئے ہیں۔''

یہ سنتے ہی یہودیوں نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا:

''یہ جھوٹا اور کذاب ہے، سب سے بُرا اور بُرے کا بیٹا ہے۔''

اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ احقاف کی آیت نمبر ۱۰ نازل فرمائی، جس کا مفہوم ہے:

'آپ کہہ دیجیے، اگر یہ (قرآن) اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اسے نہ مانا ہو اور بنی اسرائیل کا ایک گواہ (حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ) اس جیسی (کتاب یعنی تورات) کی گواہی بھی دے چکا ہو اور وہ ایمان بھی لا چکا ہو اور تم نے سرکشی کی ہو تو بے شک اللہ تعالیٰ ظالموں کو راہ نہیں دکھاتا۔

(عیون الاثر، ج:۱، ص:۲۰۷)

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی طرح کا واقعہ حضرت میمون بن یامین رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ حضرت میمون بن یامین رضی اللہ عنہ یہودیوں کے سرداروں میں سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''آپ یہودیوں کو بلا لیجیے اور مجھے فیصلہ کرنے والا بنا دیجیے، وہ میری بات مان لیں گے۔''

آپ ﷺ نے حضرت میمون بن یامین رضی اللہ عنہ کو اندر کوٹھڑی میں بٹھا دیا اور یہودیوں کو بلا لیا۔ وہ لوگ آئے، آپ ﷺ سے گفتگو کی۔ آپ نے فرمایا:

''تم اپنے لوگوں میں سے کسی کو میرے اور اپنے درمیان فیصلہ کرنے والا مقرر کر لو۔'' یہودیوں نے کہا:

''ہم میمون بن یامین کو فیصلہ کرنے والا بنانے پر راضی ہیں، وہ جو فیصلہ کریں گے ہمیں منظور ہوگا۔''

آپ ﷺ نے میمون بن یامین رضی اللہ عنہ کو آواز دے کر فرمایا:

''باہر آ جاؤ۔'' میمون بن یامین رضی اللہ عنہ کلمہ پڑھتے ہوئے باہر آ گئے، لیکن یہودیوں نے پھر بھی آپ ﷺ کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا۔

(فتح الباری، ج:۷، ص:۱۱۳)

.....(جاری ہے).....

شرجیل نے اپنے گھر کے چھوٹے سے باورچی خانے کا کونا کونا چھان مارا، مگر وہاں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ آٹا، چاول، دالیں، گھی اور دوسری تمام ضروری چیزیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ اور ماں جی، دونوں دو دِنوں سے بھوکے تھے۔ ماں جی بیمار بھی تھیں اور اِس وقت اپنے کمرے میں غنودگی کی حالت میں تھیں۔ ان کی آہ کی آواز آئی تو شرجیل لپک کر اُن کے کمرے میں داخل ہوا۔ ماں جی کی آنکھیں بند تھیں اور کبھی کبھار غنودگی کے عالم میں ان کے منہ سے آہ کی آواز نکل جاتی تھی۔ وہ یقیناً تکلیف میں تھیں۔ تیز بخار کے ساتھ بھوک کی بیماری کا کوئی علاج نہیں تھا۔ بخار کے لیے بھی کوئی دوائی میسر نہیں تھی۔

شرجیل کچھ دیر ماں جی کے پاس بیٹھ کر اُن کا سر دباتا رہا۔ جب وہ سو گئیں تو آہستہ سے اٹھا، تاکہ ان کی نیند نہ خراب ہو۔ وہ کمرے سے باہر آیا۔ یہ دو کمرے کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ غنیمت یہ تھی کہ مکان اپنا تھا۔

شرجیل کے ابا دو سال پہلے ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے۔ وہ ایک پرائیوٹ اسکول میں چوکی دار تھے۔ ان کی وفات کے بعد ماں جی نے دو تین گھروں میں صفائی ستھرائی کا کام کرنا شروع کر دیا تھا اور یوں دال روٹی چل رہی تھی۔ شرجیل کی عمر اَب تیرہ برس تھی اور وہ نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

وہ کچھ دیر تک سوچ میں گم رہا کہ کیا کرے۔ کیسے کھانے اور ماں جی کی دوائی کا انتظام کرے، پھر کسی فیصلے پر پہنچ کر اُس نے باہر کا رُخ کیا۔ اس نے آج تک کبھی ادھار پر کوئی سودا نہیں خریدا تھا، مگر اَب اس کے سوا اُسے اور کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یوں تو علاقے میں کئی جنرل اسٹور تھے، مگر اُسے اس مقصد کے لیے آقا جان کا ہی خیال آیا۔

وہ آقا جان کے جنرل اسٹور پر پہنچ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ان کا نام تو کچھ اور تھا، مگر وہ محلے بھر میں آقا جان کے نام سے ہی جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ وہ دل اور مزاج کے اچھے تھے۔ شرجیل عموماً گھر کا سودا اُنھیں سے لیتا تھا۔ وہ دو تین گاہک نمٹا کر اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''شرجیل! آج بہت دنوں بعد آئے؟'' آقا جان نے اس سے پوچھا۔

''بس جناب! کوئی خاص بات نہیں۔'' شرجیل نے کہا۔

''اچھا چلو چھوڑو۔ یہ بتاؤ، آج کیا لینے آئے ہو؟'' آقا جان نے مصروف انداز میں پوچھا۔

''وہ دراصل میں.....'' شرجیل کی زبان لڑکھڑا گئی۔ اس سے آگے اس سے کچھ نہیں بولا گیا۔ اس کی آنکھوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو آ گئے۔

آقا جان اچانک چونک اٹھے۔ شرجیل کی آنکھوں کے آنسو اُنھیں اپنے دل پر گرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ بے حد نرم انداز میں بولے:

''یہ تمھارا اپنا جنرل اسٹور ہے۔ جو چاہیے وہ لے لو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''

''وہ.....دراصل میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ کیا ادھار پر سودا مل سکتا ہے؟'' یہ کہتے ہوئے جیسے کوئی چیز گویا اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اس کی نگاہیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔

''یہ لو، یہ کون سی بڑی بات ہے۔ یہاں تو کئی لوگوں کا کھاتا کھلا ہوا ہے۔ تم آرام سے بتاؤ کہ کیا چاہیے؟'' انھوں نے اسے پیار سے تسلی دی۔

''پیسوں کا حساب پھر بھی ہو سکتا ہے۔''

''جی، وہ کچھ چیزیں چاہییں۔'' اس نے دھیرے لہجے میں بتایا۔ اس نے تھوڑی سی دال، چاول اور آٹا ہی مانگا تھا۔

''اچھا! تم یہ جوس پیو، میں تمھارا سامان پیک کرواتا ہوں۔'' انھوں نے اسے جوس کا پیک ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

بہترین عنوان تجویز کرنے پر 250، دوسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 150، تیسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 100 روپے انعام دیا جائے گا۔ ''بلاعنوان'' کے کوپن پر عنوان تحریر کر کے ارسال کریں۔

عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 31 اگست 2021 ہے۔

نوٹ: کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابلِ قبول نہ ہوگا۔

شرجیل جوس کے لیے منع کرنا چاہتا تھا، مگر آقا جان نے اسے اس بات کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ آہستہ آہستہ نلکی کے ذریعے جوس پینے لگا اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔

''لو بھئی، تمھارا سارا سامان بندھ گیا ہے۔'' آقا جان کا مصروف سا انداز شرجیل کو بے چین کر گیا۔ وہ اسے ایک بڑا سا تھیلا پکڑا رہے تھے۔

''یہ کیا ہے؟ میں نے تو صرف چند چیزوں کے لیے کہا تھا۔'' شرجیل کا لہجہ لرز رہا تھا۔

''گھر میں سو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لے جاؤ، پیسے بعد میں دے دینا۔'' انھوں نے نرمی سے جواب دیا۔

''میں یہ نہیں لے سکتا۔ ہم فقیر نہیں ہیں۔''

شرجیل کو دِلی تکلیف ہوئی۔ اس نے سامان کا تھیلا وہیں چھوڑ دیا اور آقا جان کو حیران پریشان چھوڑ کر بھاگتا ہوا ایک جانب چلا گیا۔ وہ اسے آوازیں دیتے ہی رہ گئے۔

وہ اسے حیرت سے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے اور اُن کے چہرے پر درد آمیز تاثرات دیکھے جا سکتے تھے۔

شرجیل گھر واپس پہنچا تو اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا تھا۔ ماں جی ابھی تک غنودگی کے عالم میں تھیں۔ اچانک انھوں نے کراہ کر پانی مانگا تو شرجیل لپک کر فریج کی طرف گیا۔ پانی کی بوتل نکالتے ہوئے اس نے دیکھا کہ جوس کا ڈبا اب تک اس کے دائیں ہاتھ میں دبا ہوا ہے۔ اس نے صرف چند گھونٹ ہی لیے تھے۔ اس نے ماں جی کے بستر پر ایک جانب بیٹھتے ہوئے انھیں سہارے سے بٹھایا، پھر جوس کا ڈبا ان کے منہ سے لگا دیا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کافی پیاسی لگ رہی تھیں۔ انھوں نے جوس جلد ہی ختم کر دیا، پھر تھوڑا سا پانی بھی پیا اور ایک جانب کروٹ لے کر لیٹ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد شرجیل ان کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہا تھا اور ماں جی سکون سے سو رہی تھیں۔

شرجیل پٹیاں رکھتے ہوئے، ماضی کی کئی باتیں یاد کرنے لگا۔ دو سال پہلے جب اس کے ابا کا انتقال ہوا تو وہ اور ماں جی بے سہارا ہو گئے تھے۔ جب ماں جی کچھ سنبھلیں تو اُنھوں نے دو تین گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ ان میں ایک گھر بڑی اماں کا بھی تھا۔ بڑی اماں ایک امیر اور مخیر خاتون تھیں۔ وہ اکیلے رہتی تھیں اور گھر میں دو تین نوکر تھے۔ وہ ہر دم ہر ایک کی مدد کرنے کے لیے تیار رہتی تھیں۔

شرجیل کو آج تک یاد تھا جب وہ چند ماہ پہلے ان سے آخری بار ملا تھا تو اُنھوں نے اسے زندگی میں خوب محنت کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا تھا: ''بیٹا! اگر کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت پڑے تو مجھے خوشی ہوگی کہ تم کسی اور کے پاس جانے کے بجائے میرے پاس آؤ۔''

شرجیل کو اُن کی بات اب تک یاد تھی۔ وہ بہت کمزور ہو چکی تھیں۔ ان کی اولاد نہیں تھی اور میاں بھی چند سال پہلے وفات پا چکے تھے۔ انھوں نے ماں جی کا بہت خیال رکھا تھا۔ شرجیل کو تو یہ بھی شک تھا کہ انھیں کام کے لیے مزید نوکر کی ضرورت نہیں تھی، انھوں نے صرف مدد کرنے کے جذبہ کے تحت ماں جی کو ملازمت دی تھی۔

شرجیل نے آنکھ کے کونے پر ٹکے آنسو پر اُنگلی رکھی۔ بڑی اماں کا ابھی پچھلے ہفتے ہی انتقال ہوا تھا۔ ماں جی ان کی وفات پر بہت روئی تھیں۔ سارے علاقے میں ہی ایک غم کی فضا چھا گئی تھی۔ بڑی اماں سب کی خوشی اور غم میں شامل ہونے والی خاتون تھیں۔ ان کے یہاں سے کئی گھروں میں خاموشی سے مہینے کا راشن پہنچایا جاتا تھا اور کئی طالب علموں کو وظائف بھی دیے جاتے تھے۔

ماں جی کی حالت شام تک کافی سنبھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اُن کا بخار بھی اب کافی کم ہو گیا تھا۔ وہ دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ داخلی دروازے کی گھنٹی نے انھیں چونکا دیا۔ شرجیل نے باہر جا کر دروازہ کھولا تو دروازے پر آقا جان کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان کے ساتھ ان کے جنرل اسٹور کا ایک ملازم بھی تھا جس نے کچھ سامان اٹھا رکھا تھا۔

''شرجیل! میں نصرت بہن (ماں جی) کی عیادت کی نیت سے حاضر ہوا ہوں۔ وہ اب کیسی ہیں؟'' آقا جان نے مخصوص نرم لہجے میں پوچھا۔

''جی کچھ بہتر ہیں۔ آپ آیئے، میں بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں۔'' شرجیل نے مختصر جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد آقا جان اور اُن کا ملازم سرور بیٹھک میں بیٹھ گئے تو شرجیل نے ماں جی کے کمرے کا رُخ کیا۔ ساری بات سُن کر اُنھوں نے ہمت کی اور کمزوری کے باوجود بیٹھک کے دروازے تک چلی آئیں۔ آقا جان نے پردے کے پیچھے سے ہی ان کا حال چال پوچھا اور مناسب انداز میں عیادت کی۔

''بہن! میں آپ کے گھر کے لیے کچھ سامان لایا ہوں۔ میں آپ کا پڑوسی تو نہیں، لیکن ایک ہی محلے میں رہنے کی وجہ سے میرا بھی حق بنتا ہے کہ آپ کا خیال رکھوں۔'' آقا جان نے محتاط لہجہ اختیار کیا۔

''جزاک اللہ بھائی! آج کل ہمارا وقت کچھ مشکل ہے، مگر اللہ کے فضل و کرم سے یہ بھی کٹ جائے گا۔'' ماں جی نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''مشکل وقت میں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کا خیال رکھنے کا واضح حکم ہے۔'' آقا جان نے بات آگے بڑھائی۔ ''شرجیل کچھ دیر پہلے میرے پاس آیا تھا، مگر میں اس کی کچھ خاص خدمت نہیں کر پایا تھا۔''

شرجیل کا سر جھک گیا۔ آقا جان نے اصل بات نہیں بتائی تھی۔

''بھائی! آپ یہ سامان لے کر آئے، میں آپ کے خلوص کی توہین نہیں کرنا چاہتی، مگر مجھے خوشی ہوگی اگر آپ اسے ادھار کی مد میں لکھ لیں۔ ہم ان شاء اللہ! جلد ہی رقم لوٹا دیں گے۔'' ماں جی کا جواب سُن کر شرجیل نے کچھ کہنا چاہا، مگر پھر چپ ہی رہا۔

''بہن! آپ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ جب آپ کو سہولت ہو دے دیجیے گا۔'' آقا جان نے کہا اور اُٹھ کر ملازم کے ساتھ چلے گئے۔

شرجیل نے سارا سامان باروچی خانے میں رکھ دیا۔ چائے، گھی، آٹا، چاول، دالیں اور مسالے، سبھی کچھ آقا جان ساتھ لائے تھے۔ شرجیل، ماں جی سے ناراض تھا کہ انھوں نے سامان کیوں قبول کیا۔

جواباً انھوں نے اتنا ہی کہا:

''ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے اور اللہ کریم اسی طرح وسیلے بناتے ہیں۔ ہمارے کسی پڑوسی نے ہمارے مشکل وقت میں ہمارے گھر میں نہیں جھانکا اور آقا جان نے پڑوسی نہ ہوتے ہوئے بھی ہماری مشکل کو سمجھا اور عملاً مدد کرنے کی کوشش کی۔ میں ان کے خلوص کی توہین کیسے کر سکتی تھی!''

شرجیل ان کی بات سُن کر خاموش ہو گیا۔

آقا جان سے ملاقات ہوئے تین ہفتے ہو چکے تھے۔ ماں جی کی حالت اب بہتر تھی، مگر اُنھیں دو جگہ سے کام سے جواب مل گیا تھا اور اَب صرف ایک ہی گھر کا کام ان کے پاس تھا۔ بہت مشکل سے گزارا ہو رہا تھا۔ آقا جان کا لایا ہوا سامان بھی اب ختم ہونے کے قریب تھا۔

شام کے سات بجے تھے جب آقا جان پھر اُن کے گھر میں موجود تھے اور اِس بار بھی راشن کا سامان ان کے ساتھ تھا۔

''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ بڑی اماں کے حوالے سے کچھ اہم باتیں کرنا ضروری ہیں۔'' آقا جان نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔

''جی کہیے۔'' ماں جی کا جواب مختصر تھا۔

''بڑی اماں نے انتقال سے تین دن پہلے مجھ سے بات کی تھی۔''

ماں جی اور شرجیل خاموش ہی رہے۔

آقا جان نے بات آگے بڑھائی:

''بڑی اماں کافی بیمار تھیں اور اُن کا خیال تھا کہ اب ان کا آخری وقت قریب ہے اور وہ ٹھیک ہی سوچ رہی تھیں۔

انھوں نے بتایا کہ اُن کا کوئی بھی عزیز حیات نہیں ہے اور اُن کی اولاد بھی نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے وکیل سے کہہ کر نہ صرف یہ کہ اپنی وصیت مکمل کر لی ہے، بل کہ اپنی ساری جائیداد کو ایک ٹرسٹ کی حیثیت دے دی ہے۔'

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ انھوں نے مجھے ٹرسٹ کا چیئرمین بنا دیا ہے۔'' آقا جان سانس لینے کے لیے رُکے اور پھر گویا ہوئے:

''میں اس ذمے داری کے لائق نہیں ہوں، مگر بڑی اماں کو اِنکار کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں تھا۔'' آقا جان کی آواز بھرّا گئی۔ ''وہ ایک ایسی عورت کی آخری خواہش تھی جو اپنے زندگی کے آخری لمحات گزار رہی تھی اور اُن کے ہمارے علاقے پر بہت سے احسانات تھے۔

انھوں نے اپنی وصیت میں اپنے تمام ملازمین کے لیے رقم چھوڑی ہے۔ آپ کے لیے بھی دو لاکھ روپے کی رقم ہے۔ مجھے وکیل صاحب نے آج ہی وصیت کی عدالت سے توثیق ہوجانے کے بعد بتایا ہے۔ یہ آپ کا دو لاکھ کا چیک ہے۔''

آقا جان نے ایک چیک شرجیل کی طرف بڑھایا۔ شرجیل کے ہاتھ سے چیک لیتے ہوئے ماں جی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ انھیں اس بات پر یقین کرنا مشکل لگ رہا تھا کہ اتنی بڑی رقم کا چیک ان کے لیے ہے۔

آقا جان دوبارہ گویا ہوئے:

''وہ آپ کے کام سے بہت خوش تھیں اور اُنھیں اس بات کا قلق تھا کہ آپ کی بیماری کی وجہ سے وہ آپ سے آخری بار نہیں مل سکیں۔'' آقا جان نے بتایا تو ماں جی کی آنکھیں بھر آئیں۔ انھوں نے فوراً ہی بڑی اماں کی مغفرت کی دعا کی۔

''بڑی اماں نے غریب اور مستحق طالب علموں کے لیے ہی یہ ٹرسٹ بنایا تھا اور اِسی رات مجھے اس کے بارے میں پتا چلا۔ یوں تو وہ پہلے بھی تعلیمی وظائف خاموشی سے دیتی رہتی تھیں، مگر اَب یہ کام وہ ایک ٹرسٹ کے ذریعے کرنا چاہتی تھیں۔ ٹرسٹ ہر سال دس طالب علموں کو وظائف دے گا اور پہلے سال کے وظائف میں شرجیل کا نام بھی شامل ہے۔'' آقا جان اپنی بات ختم کر کے خاموش ہوگئے۔

''اور اگر میں یہ وظیفہ نہ لینا چاہوں تو.....؟'' شرجیل کے انداز میں چیلنج تھا۔

''تو یقیناً بڑی اماں کی خواہش پوری نہیں ہو سکے گی۔'' آقا جان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ مستحق، لیکن قابل طالب علموں کو زندگی میں آگے بڑھنے کا موقع ملے اور وسائل کی کمی ان کا راستہ نہ روکے۔''

''میں پھر بھی چاہوں گا کہ مجھے یہ وظیفہ نہ دیا جائے۔'' خوددار شرجیل کا جواب پھر بھی وہی تھا۔

''ٹھیک ہے، جیسے تمھاری مرضی۔'' آقا جان نے ہار جانے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے بڑی اماں کا یہ خط ضرور پڑھ لو، جو اُنھوں نے اپنی وفات سے پہلے تمھیں لکھا تھا۔'' آقا جان جاتے ہوئے اسے ایک خط دے گئے۔

جانے سے پہلے انھوں نے شرجیل کو ایک آفر بھی کی:

''اگر تم کام کرنا چاہو تو شام کو میرے جنرل اسٹور پر تین چار گھنٹے کے لیے کام کر سکتے ہو اور یوں تم اپنی تعلیم بھی جاری رکھ سکتے ہو اور گھر کا خرچہ بھی اٹھا سکتے ہو۔''

آقا جان کے جانے کے بعد شرجیل نے بڑی اماں کا خط کھولا۔ انھوں نے سلام کے بعد لکھا تھا:

''شرجیل بیٹے! تم یہ خط پڑھ رہے ہو تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی تعلیم کے لیے وظیفہ نہیں لینا چاہتے۔ میں نے آقا جان سے کہا تھا کہ یہ خط تمھیں صرف اسی وقت دیا جائے جب تم وظیفہ کے لیے رضامند نہ ہو۔ مجھے شک تھا کہ شاید تم ایسا کرو، اسی لیے یہ خط لکھ رہی ہوں۔

تم بھی سوچ رہے ہو گے کہ آج کل خط کون لکھتا ہے، لوگ اسمارٹ فون کے ذریعے رابطہ کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ اسمارٹ فون نہ تمھارے پاس ہے اور نہ ہی میں نے کبھی رکھا۔ کبھی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی۔

خودداری ایک بہت بڑی دولت اور ایک اعلیٰ جذبہ ہے۔ خوددار لوگ نہ تو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی بے انصافی پسند کرتے ہیں۔ مال و دولت اور وسائل کی تقسیم اللہ کریم کا فیصلہ اور اُس کا اپنا نظام ہے۔ وہ جسے چاہے، جیسے چاہے نواز دیتا ہے۔ جنھیں نوازا جاتا ہے ان پر بھی یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ آگے ان وسائل کی تقسیم بہتر انداز میں کریں۔ یہ دنیا ایسے ہی چلتی ہے۔

اللہ کریم نے مجھے ہر لحاظ سے بہت نوازا ہے، لیکن اولاد کی دولت میرے حصے میں نہیں آئی۔ یہ اللہ کریم کا فیصلہ تھا اور الحمدللہ! میں نے

کبھی اس بات کا شکوہ نہیں کیا۔ اس محلے کے سارے بچے مجھے ہمیشہ اپنی اولاد ہی کی طرح لگے۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ سب کی جس حد تک بھی مدد کر سکتی ہوں ضرور کروں۔ یہ ٹرسٹ میرا اور میرے مرحوم شوہر کا ایک خواب تھا۔ یہ ہمارے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

شرجیل بیٹے! کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تم اپنے عمل سے ہمارے لیے صدقہ جاریہ بن جاؤ؟

میرے نزدیک ہر مسلمان کو سخت محنت کر کے دین و دنیا میں نام کمانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایک کام یاب انسان کی بات زیادہ توجہ سے سنی جاتی ہے۔

کیا تم ایسی آواز بننا چاہو گے؟ جب کام یابی تمھارے پاؤں چھو لے تو تم کم سے کم ایک بچے کے تعلیمی اخراجات میں ضرور مدد کرنا۔ یوں ہی چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔

لیکن فیصلہ پھر بھی تمھارا ہی ہے۔''

آخر میں بہت ساری دعاؤں کے ساتھ انھوں نے اسے اللہ کریم کی حفاظت میں دیا تھا۔

اس دن شرجیل کو پہلی بار پتا چلا کہ بڑی اماں کا نام کنیز فاطمہ تھا جو خط کے آخر میں لکھا تھا۔

اس خط نے شرجیل کو زندگی کے ایک خاص مقصد سے روشناس کرایا کہ زندگی اصل میں دوسروں کے کام آنے کا نام ہے۔ کسی کے کام اسی وقت آیا جا سکتا ہے جب انسان خود کسی قابل ہو۔

شرجیل نے بڑی اماں کا دیا ہوا تعلیمی وظیفہ قبول کر لیا اور دل میں یہ ٹھان لی کہ جب اللہ کریم اسے توفیق دیں گے اور وہ اپنی تعلیم مکمل کر لے گا تو پھر وہ بھی کسی ضرورت مند طالب علم کی ایسے ہی مدد کرے گا۔

ارے، ہم آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ آقا جان، شرجیل کے کام سے بہت خوش ہیں۔ وہ شام کے چار گھنٹے ان کے جنرل اسٹور پر کام کرتا ہے اور رات کو اپنی پڑھائی کرتا ہے۔ اس کی ماں جی کو اَب گھروں میں کام نہیں کرنا پڑتا۔

ننھے عاصم نے دادا جان کی کمر پر چڑھ کر اُن پر سیر کرنے کا ایسا مزہ چکھ لیا ہے کہ اب روز ہی وہ دادا جان سے اپنی توتلی زبان میں ''دولا (گھوڑا)'' بننے کی فرمائش کرتا ہے اور دادا جان ہنس پڑتے ہیں کہ ''بھئی! میں اپنی جسامت اور طاقت وغیرہ، کسی بھی چیز میں دولا نہیں بن سکتا۔

یہ سن کر ننھا عاصم بُری طرح مچل جاتا ہے اور اُس کے مطالبوں میں شدت آجاتی ہے، تب دادا جان ہتھیار ڈال دیتے ہیں:

''اچھا، اچھا بیٹے! لو گھوڑا بن جاتا ہوں۔ لو بن گیا گھوڑا!'' اور عاصم ان پر چڑھ کر اُس وقت تک کھیلتا رہتا ہے جب تک دادا جان تھکن سے بے حال نہیں ہو جاتے۔ دادا جان کا تو لکھنا اور پڑھنا ہی عاصم نے مشکل کر دیا ہے۔ عاصم تین بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور لاڈلا بچہ ہے۔

عشا کے بعد جب عاصم سو چکا تھا اور دادا جان ایک کتاب پڑھنے میں مصروف تھے کہ قاسم اور صبوحی ہوم ورک کر کے دادا جان سے کہانی سننے آ گئے۔

''اوہ دادا جان! یہ کون سی کتاب ہے؟ اتنی بڑی اور موٹی؟'' صبوحی نے تعجب سے دادا جان کی کتاب کو اُٹھانے کی کوشش کی۔

''چھوڑو، تم سے نہیں اٹھے گی یہ! میں بڑا، ہوں دسویں جماعت کا طاقت وَر بچہ ہوں، تم تو ابھی صرف آٹھویں میں ہو! دیکھو، میں ابھی اسے اٹھا کر دِکھاتا ہوں۔''

قاسم نے کتاب اٹھا کر ہنستے ہوئے کتاب کا نام دیکھا: ''آل انڈیا مسلم لیگ از آزاد حیدر!'' قاسم نے تعجب سے آنکھیں پھیلائیں۔

قاسم کی بات سن کر دادا جان نہ ہنسے اور نہ کچھ بولے۔ قاسم نے بغور دیکھا تو حیرانی سے بولا:

''آ..... آپ رو رہے ہیں؟'' دادا جان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر صبوحی کے منہ سے نکلا:

''دادا جان بھی روتے ہیں؟''

''ہاں بیٹی! رونے کی بات ہو تو رونا آ ہی جاتا ہے!'' دادا جان نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آج آپ کہانی نہیں سنائیں گے؟'' صبوحی نے مطلب کی بات کی۔

''سناؤں گا، ضرور سناؤں گا۔''

دادا جان نے کتاب قاسم سے لے کر احتیاط سے میز پر رکھی اور دونوں بچوں کو اپنے پاس بٹھا کر کہنے لگے:

''میرے بچو! آج میں تمھیں انگریزوں کی کہانی سناؤں گا۔''

''ویسی کہانی، جو ایک انگریز بچی جنگل میں بطخ لے کر جاتی ہے اور وہ.....'' صبوحی سوچنے لگی۔

''نہیں، یہ کہانی سناؤں گا کہ برصغیر جو ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا مجموعہ ہے، اس برصغیر میں انگریز کیسے آئے تھے؟ انھوں نے کیسے یہاں مضبوطی سے قدم

ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی۔ کراچی

آزادی کا سورج ۱

جمائے اور پھر کیسے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا اور اُنھیں طرح طرح کی اذیتیں دیں۔''

''ارے، وہ آئے کیوں تھے؟ انھیں کس نے بلایا تھا؟'' صبوحی نے غصے سے کہا۔

''صدر یا وزیراعظم نے بلایا ہوگا۔'' قاسم نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تمھاری بات کسی حد تک ٹھیک ہے، مگر اُس وقت صدر نہیں، بادشاہ ہوتے تھے۔ مغل بادشاہ جہانگیر سے یہ پہلی غلطی ہوئی اور تقریباً ڈھائی سو سال کی مسلسل نفرت، لوٹ کھسوٹ اور شاطر سیاسی چالوں سے انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی، پھر اُن کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا، جب کہ وہ ایسے وقت میں ہندوستان میں داخل ہوئے تھے جب مسلمانوں کی ترقی اور عروج کا سورج اپنی پوری آب و تاب پر تھا۔'' دادا جان نے دونوں بچوں کو بتایا۔

''دادا جان! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی ڈھائی سو یا دو سو سال تک بادشاہوں سے دشمنی کرتا رہے اور پھر بادشاہ بن کر بیٹھ جائے؟'' قاسم نے تعجب سے کہا۔

''قاسم بھیا! زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ کوئی آدمی یا کوئی کمپنی ڈھائی سو سال زندہ کیسے رہ سکتی ہے؟'' صبوحی نے معصومیت سے کہا تو دادا جان کو ہنسی آ گئی۔

''بیٹی! وہ لوگ جنھوں نے ''برٹش ایسٹ انڈیا'' کی بنیاد لندن میں سولھویں صدی کے شروع میں رکھی تھی، وہ ڈھائی سو سال زندہ نہیں رہے تھے، بل کہ وہ مرنے سے پہلے اپنی دشمنی کا گھٹیا مشن اپنے کینہ پرور چالاک نوجوانوں کو سونپ کر مرتے تھے۔ دشمن غافل نہیں تھا، بے حد چالاک تھا اور وہ یہ مقصد لے کر ہی آیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کرنا ہے، وہ بھی اس مضبوط مسلم سلطنت کو جو دُنیا میں ایک مثال تھی۔

''دادا جان! یہ سب کیسے ہوا؟ کچھ ہمیں بھی تو بتائیں؟'' قاسم نے دل چسپی کا اظہار کیا۔

''ہاں، میرے بچو! میں تمھیں سب بتاتا ہوں:

''برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی، جس کا مقصد تجارت کے ذریعے ہندوستان پر قبضہ تھا، برطانوی حکومت کی اجازت سے ان کے سفیر 1613ء میں ہندوستان آئے اور مغل بادشاہ جہانگیر سے ''سورت'' کے علاقے میں مستقلاً ایک تجارتی کوٹھی قائم کرنے کا اجازت نامہ حاصل کرلیا۔ اس کے فوراً بعد ''تھامس رو'' کو دربار میں سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ 1618ء تک تھامس رو، ہندوستان میں مقیم رہا اور نتیجۃً کمپنی کے لیے بعض تجارتی مراعات حاصل کرنے میں کام یاب ہو ہی گیا۔

1619ء میں ''تھامس رو'' کی حاصل کی ہوئی ان مراعات کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کو سورت کے ساتھ ساتھ آگرہ، احمد آباد، بھروچ اور بڑودہ میں بھی تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت مل گئی، پھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہ چارلس دوم کا خریدا ہوا سنسان جزیرہ بمبئی بھی دس پونڈ کرائے پر لے لیا، تاکہ انڈیا میں قدم جمائے جاسکیں۔

1626ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ''آرام'' نامی گاؤں اور 1639ء میں مدراس میں بھی تجارتی کوٹھیاں قائم کرلیں اور مدراس میں ''قلعہ سینٹ جارج'' تعمیر کرایا، جو اُن کا مضبوط تجارتی، مذہبی اور سیاسی مرکز تھا۔ اس کے بعد اس کمپنی نے اپنی توجہ ''مشرقی ساحل'' پر کی اور وہاں اپنی پوزیشن مستحکم اور مضبوط کرنا شروع کردی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مزید فائدے حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پیر مارے اور 1651ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہ شجاع سے تین ہزار روپے سالانہ ٹیکس دے کر تجارتی سہولیات حاصل کیں۔ اب انھیں مزید پاؤں پھیلانے کی فکر ہوئی۔ وہ بادشاہ سے رابطے کرتے رہے، بالآخر 1652ء میں کمپنی کو یہ اجازت دے دی گئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی دریاؤں اور خشکی کے ذریعے جو مال باہر لے جائے یا ہندوستان میں کہیں بھی لے جائے، اس پر مزید محصول (ٹیکس) نہیں لیا جائے گا اور کمپنی کا مال تلاشی اور پڑتال کے بغیر ہر جگہ پورے ملک میں بھیجا جاسکتا ہے۔''

''دادا جان! بغیر تلاشی کے تو اپنے ملک کے تاجر بھی مال اِدھر اُدھر نہیں لے جاسکتے؟'' قاسم نے تعجب سے کہا۔

''ہاں بیٹا! چالاک اور عیّار انگریزوں نے جھک جھک کر ایک ایک ٹیکس کی ادائیگی سے بادشاہ کا اعتماد حاصل کرلیا تھا۔

ان سہولیات سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے دن دُونی رات چوگنی ترقی کی، مالی اور سیاسی مضبوطی پائی اور امیر سے امیر ترین ہوتے گئے۔ چناں چہ اگلے بیس برسوں میں وہ مشرقی ساحل پر صرف تاجر کی حیثیت ہی سے نہیں، بل کہ فوجی حیثیت سے بھی طاقت پکڑ چکے تھے۔

1690ء میں کمپنی نے ستونی (بنگال کا ایک علاقہ) میں تجارتی کوٹھی قائم کرکے اپنے حساب سے اسی سال 1690ء میں اپنے مستقبل کے ''انگریز دارالحکومت'' کی بنیاد رکھ دی۔ انھوں نے سترھویں صدی میں کلکتہ میں اپنی تجارتی کوٹھیوں کی قلعہ بندی مکمل کرلی۔

انھی دنوں شاہ جہاں کی بیٹی، گل بدن بیمار ہوئی تو کسی انگریز ڈاکٹر نے

شہزادی کا علاج کیا۔ بادشاہ بولا:

''کیا لوگے؟'' ڈاکٹر بولا:

''مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے، اپنی قوم کے لیے کچھ چاہیے۔''

''اوہو، داداجان پوری قوم کو تو بادشاہ انعام دے کر بالکل کنگال ہوگیا ہوگا!؟'' قاسم نے گھبرا کر کہا۔

''نہیں بیٹے! ڈاکٹر بہت چالاک تھا، اور اُسے اپنی پوری قوم سے محبت اور مسلمانوں سے نفرت تھی۔ اس نے یہ چالاکی کی کہ شاہ جہاں سے کہا:

''ہمیں ہندوستان میں تجارت کی آسانیاں دے دیں۔ مجھے آپ سے اپنی قوم کے لیے سہولت چاہیے''، پھر اُس نے کچھ عرصے بعد شاہ جہاں سے یہ فرمائش کی کہ ہمیں ٹیکس اور چیکنگ کی پابندی سے آزاد کردیں۔

اس سے یہاں تک کہ ہوا کہ اگر کبھی ہندوستانیوں کو ٹیکس اور چیکنگ سے بچنا ہوتا تھا تو وہ بھی اپنے پانی کے جہازوں پر برطانیہ کے جھنڈے لہرا کر حفاظت سے بغیر چیکنگ اور محصول دیے گزر جاتے تھے۔

بادشاہ کو یہ خیال ہی نہیں آیا کہ وہ دوطرفہ تجارت کی بات کرتا، اُس نے تو انعام میں تجارتی مراکز قائم کرائے تھے، مگر مسلمان تاجر بجائے اس کے کہ برطانیہ میں اپنی بھی تجارت کے لیے جاتے اور دوطرفہ تجارت مستحکم ہوتی، وہ صرف انگریزوں کا مال خریدتے، جو بہت مہنگا ہوتا تھا۔ لوگ اُسے دور کا، یعنی ''ولایت'' سے آیا ہوا تحفہ اور سوغات سمجھتے اور منہ مانگے داموں ان کا سامان خریدتے۔ اس طرح انگریز، مسلمانوں سے مال کما کما کر مالی طور پر خوب مستحکم ہوگئے۔ ان کی اشیا کی مانگ بڑھتی گئی اور ہندوستانی مسلمان تاجروں کی اشیا ان کی نسبت کم اہم ہوتی گئیں۔

شاہ جہاں بادشاہ کے بعد جب اورنگزیب عالمگیر بادشاہ کا دَور شروع ہوا تو عالمگیر نے پچاس سال کے عرصے میں اس سلطنت کو ترقی دے کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ سلطنت وسیع ہوگئی، آبادی اور دولت و سلطنت کے معاملے میں اورنگزیب عالمگیر کی یہ قوم دنیا کی سب اقوام میں مثالی، فلاحی قوم تھی۔ بادشاہ اورنگزیب نے اپنی بادشاہت کی بھاری ذمے داریوں میں شدید انہماک، بہادری، محنت اور جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کیا، اس بنا پر اورنگزیب کا مسلمان حکمرانوں میں ایک اعلیٰ مقام ہے۔

ذاتی زندگی میں وہ نیکی اور پرہیزگاری کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ وہ ایسی سب خرابیوں سے بہت دور تھے جو ایشیا کے حکمرانوں اور شہزادوں میں بالکل عام تھیں۔ ان کا انداز سادہ تھا، بل کہ وہ ایک درویش صفت بادشاہ تھے۔ نمائش اور آرام و آسائش سے ان کی زندگی خالی تھی۔ کھانے، لباس اور ضروریاتِ زندگی میں بہت سلیقے اور کفایت شعاری سے کام لیتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کا آئیڈیل تھے۔ اپنی اتنی بڑی سلطنت کا انتظام کرنے کے باوجود اورنگزیب عالمگیر کچھ وقت نکال کر قرآن پاک کی کتابت کرکے اور ٹوپیاں سی کر اپنی گزر بسر کرتے تھے۔ اورنگزیب کا روزمرہ کا معمول بہت سخت تھا۔ وہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں صرف تین گھنٹے سوتے تھے۔

خود کام کرنے اور دوسروں سے کام لینے میں وہ بہت ہی سخت گیر تھے۔ اپنی عظیم سلطنت کے انتظامی کاموں میں سے چھوٹے چھوٹے کاموں تک کی نگرانی وہ خود کرتے تھے اور ہر فوجی مہم کے لیے خود ہدایات جاری کرتے تھے۔ وہ بے انتہا قوت کے مالک تھے اور ناقابلِ تسخیر عزم سے سرشار تھے۔ جہاں تک ''انصاف'' کے نظام کا تعلق ہے، اورنگزیب کو پورا احساس تھا کہ غیر مسلم رعایا پر اسلامی قانون نافذ نہیں ہوتے تو اُن کے معاملات کا فیصلہ ان کے اپنے مذہب کے اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے۔''

داداجان سانس لینے کے لیے خاموش ہوئے تو قاسم نے پوچھا:

''داداجان! یہ سب آپ نے کہاں پڑھا؟''

''یہ تفصیل میں نے اس بھاری سی کتاب میں پڑھی ہے، تم چاہو تو تم بھی پڑھ سکتے ہو۔'' داداجان بولے۔

''میں بھی یہ پوری کتاب پڑھوں گا۔'' قاسم نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔

''اورنگزیب کی غیر مسلموں سے یہی رواداری اور حسنِ سلوک تھا جس کی وجہ سے انگریز بظاہر معصوم بن کر اندر ہی اندر عظیم مسلم سلطنت کو دِیمک کی طرح چاٹتے رہے۔ جہانگیر کے بعد شاہ جہاں کے دور میں انگریزوں کو کُھل کر اپنا کھیل کھیلنے کا موقع ملا تھا۔ اورنگزیب نے بھی اپنے والد کی طرح ''رواداری'' کرتے ہوئے انگریز تاجروں کو محدود نہ کیا، لیکن اورنگزیب کے دور میں انگریز کُھل کر اپنا کوئی بھی کھیل نہ کھیل سکتے تھے، کیوں کہ اورنگزیب خدا پرست مجاہد اور جاگتے رہنے والے بادشاہ تھے۔

اورنگزیب کی حکومت کے پچاس سال میں انگریزوں کے تجارتی مرکز تو پورے ہندوستان (موجودہ برصغیر) میں کام کرتے رہے، مگر اُنھوں نے بڑی خاموشی سے اپنی تجارت بڑھائی، کوئی فتنہ فساد نہیں مچایا، اس لیے کہ اورنگزیب کے پچاس سالہ دورِ حکومت میں اتنی بڑی سلطنت میں کوئی

فتنہ سر اُٹھانے نہیں پاتا تھا کہ کچل دیا جاتا تھا، پھر اورنگزیب کا انتقال ہو گیا اور بعد کے مغل حکمران چوں کہ نیکی، پرہیز گاری اور درویشی سے دور تھے، وہ عیش و آرام، دنیاوی چمک دمک اور عیاشیوں میں پڑ گئے۔ ایسے میں ملک بھر میں جگہ جگہ سازشیں سر اُٹھانے لگیں۔ اُن میں سے ایک نمایاں سازش اور بڑا عذاب انگریز تاجر ثابت ہوئے۔''

''تاجر عذاب کیسے بن گئے؟ وہ تو صرف تجارت کرتے تھے، حکومت تو نہیں کرتے تھے؟'' قاسم نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بیٹے! لیکن انگریز نے پہلے تجارت کے ذریعے ہندوستان میں اپنے قدم مضبوطی سے جمائے، پھر مضبوط تجارت قائم کر کے وہ آپس میں متحد ہوئے اور اُنھوں نے غدار تلاش کیے، تاکہ مسلمانوں میں فساد پیدا کر کے پھوٹ ڈال دیں، پھر اُن کی سلطنت کو ختم کر کے خود حاکم بن جائیں۔ یہ منصوبہ تھا انگریزوں کا، جو وہ اورنگزیب کے پچاس سالہ دورِ حکومت میں پورا کر ہی نہیں سکتے تھے۔

کوئی بھی سازش اُسی وقت کام یاب ہوتی ہے جب وہ غافل اور عیش کرنے والے لوگوں کے خلاف کی جائے۔ جنگ ہوتی رہے اور ناچ گانے کی محفلیں بھی ہوتی رہیں تو دشمن دس سالوں کا کام، دس مہینوں میں کر ڈالتا ہے۔''

''ہائے اللہ! جبھی آپ نے میرا ہیڈ فون لے کر رکھ لیا تھا دادا جان! میں بھی گانے سنتی رہتی تھی۔''

''اور میں ہر وقت گیم کھیلتا ہوں انٹرنیٹ پر غافل لوگوں کی طرح۔'' قاسم اُداسی سے بولا۔

''سترھویں صدی کی نصفِ آخر، ہندوستانی مسلم حکومت اور عوام کے لیے بدترین المیے کی خبر تھی۔ اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ ہی مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہو گیا۔ بادشاہ کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی، ہر جگہ کے نواب اور راجا چھوٹی چھوٹی ریاستیں لے کر الگ ہو گئے۔ صوبے اپنی مرضی سے مرکز سے الگ ہو گئے، مغلیہ سلطنت کے ٹکڑے ہو گئے اور بہادر شاہ ظفر کی حیثیت شطرنج کے بادشاہ جیسی رہ گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بہت سے فتنے اور تفریق خود پیدا کی اور اَب خود بھی مقامی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

1857ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارکان نے (جو بظاہر تاجر نظر آتے تھے) اپنی سازشوں اور مکاریوں سے کام لے کر بنگال میں سیاسی بالادستی قائم کر لی۔''

اب صبوحی کو نیند آ رہی تھی اور دادا جان ۱۸۵۷ء کے ذکر سے بہت رنجیدہ ہو گئے تھے، جب کہ قاسم پوری دل چسپی سے سن رہا تھا۔

''دادا جان! آگے بتائیں؟ ۱۸۵۷ء میں کس نے کس سے جنگ لڑی تھی؟ ہماری کتاب میں تو بہت مختصر سا ذکر ہے اور وہ بھی سمجھ میں نہیں آتا، بس ہم رٹ لیتے ہیں!'' قاسم نے منہ بنایا۔

اُسی وقت امی کمرے میں آئیں:

''ارے بچو! سونا نہیں ہے کیا؟ سن کر تم اپنے دادا جان کا کیا حال کر دیتے ہو؟ چلو، انھیں دوا اور خود بھی سو جاؤ، تمھیں صبح اسکول بھی جانا ہے۔''

امی نے کہا اور دادا جان نے بچوں کو سمجھا بجھا کر سونے کے لیے بھیج دیا۔

کہانیاں سن آرام کرنے

.....جاری ہے.....

سوال آدھا جواب آدھا ۲۳

الطاف حسین۔ کراچی

اس کھیل میں چند جملے ہیں، ہر جملہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں کچھ معلومات دی گئی ہیں، جب کہ دوسرے حصے میں اسی طرح کی معلومات آپ سے پوچھی گئی ہیں۔ آپ مطلوبہ معلومات ہمیں ۳۱، اگست تک ارسال کر دیجیے، ہم آپ کو اِس کا انعام روانہ کر دیں گے۔ ایک سے زیادہ درست جوابات موصول ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعے تین قارئین کرام کو اِنعام سے نوازا جائے گا۔ کوپن پُر کر کے ساتھ بھیجنا نہ بھولیے گا۔

❶ حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید کی چار سورتوں (سورۂ نساء، سورۂ انعام، سورۂ انبیاء اور سورۂ ص) میں آیا ہے..... آپ یہ بتائیے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا تذکرہ قرآن مجید کی کون سی چار سورتوں میں آیا ہے؟

❷ حضرت جبرائیل علیہ السلام انبیائے کرام علیہم السلام کے پاس ''وحی (اللہ کا پیغام)'' لایا کرتے تھے..... کیا آپ جانتے ہیں کہ اُس فرشتے کا کیا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مخلوق خدا کی روح قبض کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہے؟

❸ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی کنیت ''ابو اِسحٰق'' تھی..... بتائیے کہ خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی کنیت کیا تھی؟

❹ سورج گرہن کے موقع پر جو نماز اَدا کی جاتی ہے اس کا نام ''نمازِ کسوف'' ہے..... آپ یہ بتائیے کہ ''نمازِ خسوف'' کس موقع پر پڑھنی چاہیے؟

❺ شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان پر گیارہ مرتبہ حملہ کیا تھا..... کیا آپ جانتے ہیں کہ کس مشہور مسلمان حکمران نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے تھے؟

❻ ''الشامل فی الطب''، مشہور طبیب اور سائنس دان ''ابن نفیس'' نے لکھی تھی..... آپ یہ بتائیے کہ ''الکلیات فی الطب'' کے مصنف کا کیا نام ہے؟

❼ گیمبیا کے دارالحکومت ''بنجول'' کا قدیم نام ''باتھرسٹ'' تھا..... آپ یہ بتائیے کہ اسلامی دنیا کے لحاظ رقبہ سب سے بڑے ملک قازقستان کے دارالحکومت ''آستانہ'' کو ماضی میں کیا کہا جاتا تھا؟

❽ ''کھانے کا سوڈا'' کیمیائی زبان میں ''سوڈیم بائی کاربونیٹ'' کہلاتا ہے..... اگر کوئی آپ سے کہے کہ ایک کلوگرام ''سوڈیم کلورائیڈ'' لے آئیں تو آپ کیا خرید کر لائیں گے؟

❾ ''کانوں پر ہاتھ رکھنا'' اردو زبان کا ایک محاورہ ہے، جس کا مطلب ہے: ''لاعلمی کا اظہار کرنا، کسی بات سے انکار کرنا''..... بتائیے ''کان بھرنا'' کا کیا مطلب ہے؟

منکی الیون

محمد فیصل علی۔ سناواں

''امی! امی! آج مجھے اسکول میں سزا ملی ہے۔''

ننھے میمنے نے رونی صورت بنا کر کہا اور اپنا بستہ ایک طرف رکھ دیا۔

''ارے، وہ کیوں!؟'' اس کی امی نے پوچھا۔

''میں اور میرے دوستوں نے مل کر اِسکول کے باغ سے پھول توڑے تھے نا اس لیے!''

میمنے نے بتایا تو اُمی نے گہری سانس لی، پھر وہ بولیں:

''بیٹا! اسکول والوں نے آپ کو پھول توڑنے سے منع کیا ہوا ہے نا!؟''

''جی امی! سختی سے روکا ہوا ہے انھوں نے۔''

اس نے معصومانہ لہجے میں بتایا تو اُمی بے اختیار ہنس دیں۔

''پھر تو سزا ملنی چاہیے تھی بیٹا! کیوں کہ آپ نے اسکول والوں کی بات جو نہیں مانی۔ آئندہ ان کی ہر بات ماننا، ٹھیک ہے؟'' امی نے اسے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے امی! لیکن وہ تھے تو چند پھول!'' میمنے نے منہ بنایا۔

''بیٹا! بات پھولوں کی تو نہیں، بات تو حکم توڑنے کی ہے۔ چلو میں تمھیں ایک کہانی سنا کر یہ بات سمجھاتی ہوں، کیا تم سنو گے؟''

''جی امی! سنائیے، لیکن.....''

''لیکن کیا بیٹے!؟''

امی نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ مجھے ''منکی الیون (Monkey Eleven)'' والی کہانی سنائیں جو اِس مرتبہ ہمارے اسکول کے رسالے میں آئی ہے، یہ رہا وہ رسالہ۔''

میمنے نے بستے سے ایک رسالہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔

''بہت شرارتی ہو تم! اچھا دکھاؤ، میں پڑھ کر سناتی ہوں، لیکن خاموشی سے سننا۔''

امی نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر وہ رسالہ کھول کر کہانی سنانے لگیں۔

.....☆.....

یہ جنگل کی ایک رہائشی کالونی تھی۔ یہاں بکریوں اور بھیڑوں کے مکانات ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ چاروں طرف سناٹے کا راج تھا۔ ہر کوئی اپنے گھر میں مزے کی نیند سو رہا تھا۔ ایسے میں ایک سایہ پھرتی سے چھلانگیں لگاتا، ایک درخت سے دوسرے درخت پر منتقل ہوتا آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ اس کا رُخ اسی رہائشی کالونی کی طرف تھا۔ چوں کہ مکانات کے ساتھ ساتھ بھی درختوں کی بہتات تھی، اس لیے اس سائے کو زمین پر پاؤں بھی نہ رکھنے پڑے اور وہ درختوں سے ہوتا ہوا اُن مکانات تک جا پہنچا۔

اب اسے اپنے مطلوبہ مکان کی تلاش تھی۔ اس نے جیب سے ایک نقشہ نکالا اور اُسے بغور دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے اپنے مطلوبہ مکان کو تلاش کر ہی لیا۔ اب وہ درختوں پر لٹکتا، اچھل کود کرتا اس مکان کی چھت پر جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے ایک گہری سانس لی اور پھر زینے کی طرف بڑھ گیا۔

زینے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے جیب سے ایک مڑا ہوا تار نکالا اور دروازہ کھولنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ زینے کی مدد سے گھر کے اندر پہنچ چکا تھا۔

''آخر کس جگہ ہو گی وہ کتاب؟''

وہ زیرِ لب بڑبڑایا اور پھر ایک بند کمرے کی طرف بڑھ گیا جو ''اِسٹور

روم" جیسا نظر آرہا تھا۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر گھس گیا اور کمرے میں ایک کتاب تلاش کرنے لگا۔ ایک الماری کی تلاشی کے دوران میں ایک کتاب کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں کامیابی کی چمک لہرائی۔ اس نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے وہ کتاب اپنے بیگ میں ڈالی اور واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ مکان سے صحیح سلامت نکل کر اپنے ٹھکانے کی طرف اڑا جا رہا تھا۔

.....☆.....

اس کا نام منکی سیون تھا۔ منکی وَن نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک گینگ بنایا تھا جس میں کل گیارہ منکی تھے۔ ان کا ٹھکانا ایک غار تھا۔ جب منکی سیون غار میں پہنچا تو اُس کا دوست منکی وَن اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر وہ چہکا:

"میرے پیارے دوست منکی سیون! آخر تم آ ہی گئے، کیا رپورٹ ہے؟"

"میں اور ناکام لوٹوں، یہ سوچنا بھی مت منکی وَن!"

"یعنی تمھیں کتاب مل گئی ہے؟"

"جی ہاں، یہ رہی۔"

"شان دار!"

"اب اگلا مرحلہ کب شروع کرنا ہے؟"

"میں کتاب کو پڑھ کر اِس میں موجود نقشے کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، اس کے بعد ہم اگلا مرحلہ شروع کریں گے۔"

"ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، لیکن تب تک تم منکی ٹُو سے منکی الیون تک، تمام دوستوں کو تیار کر لو۔"

"سمجھ گیا۔"

"ٹھیک ہے، اب جاؤ۔"

اس مکالمے کے بعد دونوں بندر دوست اپنے اپنے راستوں پر ہو لیے۔

.....☆.....

"اس کتاب میں ایسا کیا تھا آخر کہ اسے چُرا لیا گیا؟"

جاسوس خارپشت، بکری سے سوالات پر سوالات کیے جا رہا تھا۔

"میں بتا چکی ہوں کہ وہ کتاب بہت قدیم ہے اور اُس میں کچھ نقشے بھی تھے جن پر مجھے کام کرنا تھا، تاکہ میں ان کے بارے میں جان سکوں، لیکن میری تحقیق سے پہلے ہی وہ کتاب چوری ہو گئی۔" بکری نے جواب دیا۔

"سمجھ گیا، اب میری ٹیم یہاں کا جائزہ لے گی۔"

خارپشت نے گھر پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ضرور لیں۔" بکری نے بُرا سا منہ بنایا۔

"انکل! کیا یہ نقشہ آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہے؟"

اچانک میمنے نے ایک کاغذ آگے بڑھایا تو خارپشت اور بکری، دونوں اچھل پڑے۔

"یہ کیا ہے اور تمھارے پاس کیسے آیا؟"

بکری نے وہ کاغذ اُس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

"میں نے یہ نقشہ اسی کتاب سے نقل کیا تھا۔ دراصل مجھے نقشہ نویسی کا بہت شوق ہے نا اس لیے!" میمنے نے معصومیت سے کہا۔

"ارے ننھے میاں! بہت خوب! لگتا ہے ہم اس نقشے سے کچھ مدد لے سکتے ہیں۔"

خارپشت نے میمنے کو سراہا۔ ادھر بکری نقشے پر جھک گئی تھی۔ وہ کافی دیر نقشہ دیکھتی رہی، اس نے کئی کتابوں سے مدد بھی لی۔ آخر کار اُس کی آواز اُبھری:

"یہ نقشہ تو سم سم غار کا ہے۔"

"اوہ، اس کا مطلب ہے کہ ہمیں وہاں کی نگرانی کرنی چاہیے، ممکن ہے کہ چور بھی وہاں پہنچے۔" خارپشت نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"بالکل درست جاسوس صاحب! نقشے میں ایک اور بات بھی درج ہے، اور وہ یہ کہ سم سم غار میں ایک پرانا خزانہ دفن ہے۔"

بکری نے ڈرامائی انداز میں کہا اور خزانے کا سُن کر خارپشت کی آنکھوں میں چمک لہرا گئی۔

.....☆.....

"نقشے کے مطابق یہی وہ جگہ ہے، کھودنا شروع کرو۔"

منکی وَن نے حکم دیا اور باقی سارے بندر کام پر لگ گئے۔ وہ کافی دیر کھدائی کرتے رہے، آخر کار اُنھیں ایک صندوق مل ہی گیا۔

"مل گیا!"

ایک بندر نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ بھی مل گیا اور ہم بھی آ گئے، ہے نہ کمال!"

اچانک غار میں خارپشت کی آواز گونجی اور سبھی بندر اُچھل پڑے۔ اس سے پہلے کہ وہ حرکت کرتے ایک کرخت آواز گونجی:

"تم سب ہمارے نشانے پر ہو، ہلنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔"

انسپکٹر کیٹ کی آواز گونجی۔ بندروں نے دائیں بائیں دیکھا تو چاروں طرف پولیس کی نفری نظر آ رہی تھی۔ انھوں نے اپنے ہاتھ اوپر کر لیے۔

ایسے میں بکری غار میں داخل ہوئی اور سیدھی خزانے والے صندوق کی طرف بڑھی:

''مجھے حیرت ہے کہ منکی الیون ٹیم کو اِس کتاب کی خبر کہاں سے ملی؟ کیا تم بتاؤ گے مسٹر منکی وَن!؟''

بکری نے صندوق پر ٹانگ رکھتے ہوئے کہا۔

''میرے ساتھی اردگرد پر نظر رکھتے ہیں، اس لیے جب تمھیں یہ کتاب ملی تو ہمیں بھی اطلاع مل گئی۔'' منکی ون نے جواب دیا۔

''چلو، دیکھتے ہیں کہ اس صندوق میں کیا ہے؟''

بکری نے کہا اور پھر اُس نے صندوق کھول لیا، ساتھ ہی اس کی آواز سنائی دی:

''یقین ہی نہیں آ رہا، حیرت انگیز!''

''کیا مل گیا آخر؟''

خارپشت آگے بڑھا اور پھر اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں، صندوق سونا چاندی اور جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔

''ماشاءاللہ! اس مطلب یہ ہوا کہ اب جنگل کا بیت المال بھر جائے گا۔''

خارپشت نے چہک کر کہا۔

''بالکل! یہ سارا خزانہ بیت المال کا ہی حصہ بنے گا اور منکی الیون کے ساتھی جیل کا حصہ بنیں گے بے چارے!'' بکری نے کہا تو سبھی زور سے ہنس پڑے، جب کہ منکی الیون کے ممبرز کے منہ پہلے سے بھی زیادہ لٹک گئے، کیوں کہ اب انسپکٹر کیٹ کی ٹیم انھیں ہتھکڑیاں لگا رہی تھی۔

''لو بھئی تمھاری کہانی ختم ہوگئی۔ اب جاؤ اور کچھ دیر آرام کرو۔''

امی نے کہانی سنا کر میمنے سے کو کہا۔

''ٹھیک ہے امی! آج کے بعد میں نہ تو اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم توڑوں گا اور نہ ہی اسکول والوں اور اپنے بڑوں کا۔ میں کل اسکول میں اپنے حاصل مطالعہ کے طور پر اسمبلی میں یہی منکی الیون والی کہانی پیش کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے چوری سے منع کیا ہے اور جنگل کی حکومت نے بھی منع کیا ہوا ہے، لیکن جب منکی الیون کی ٹیم نے اس حکم کو توڑا تو وہ سب پکڑے گئے، ہیں نا امی! ایسا ہی ہوا تھا نا!؟''

میمنے نے کہانی سے نتیجہ نکالتے ہوئے کہا۔

''بالکل درست! اب جاؤ اور کچھ دیر آرام کرلو۔''

امی کے کہنے پر ننھا میمنا فوراً چل دیا، کیوں کہ اس نے بڑوں کا کہنا ماننے کا عزم جو کرلیا تھا۔

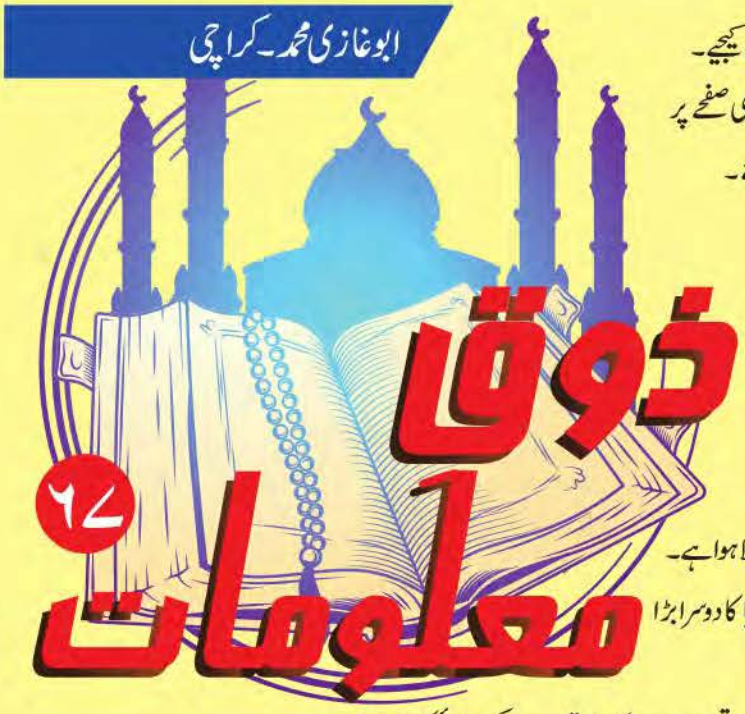

ابوغازی محمد۔ کراچی

یہ گُل پانچ اشارات ہیں۔ آپ ان کی مدد سے درست جواب تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔

اگر آپ ان اشارات کے ذریعے جواب تک پہنچ جائیں تو بُوجھا گیا جواب آخری صفحے پر موجود کوپن کے ساتھ ہمیں ارسال کر دیجیے اور اپنی معلومات کا انعام ہم سے پائیے۔

آپ کا جواب ۳۱ اگست تک ہمیں پہنچ جانا چاہیے۔

یہ کیا ہے؟

۱ یہ ملک شمالی امریکا کے شمال میں واقع ہے اور بحرِ اوقیانوس سے بحرِ الکاہل تک پھیلا ہوا ہے۔

۲ اس ملک کا رقبہ 9,976,139 مربع کلومیٹر ہے۔ رقبے کے لحاظ سے یہ دنیا کا دوسرا بڑا ملک شمار ہوتا ہے۔

۳ اس ملک کے دارالحکومت کا نام ''اوٹاوہ'' ہے۔ اس ملک میں رائج کرنسی ڈالر کہلاتی ہے۔ اس ملک کا قومی دن یکم جولائی کو منایا جاتا ہے۔

۴ اس ملک کی سب سے بلند پہاڑی چوٹی کا نام ''کوہِ لگان'' ہے، جس کی بلندی 19,850 فٹ ہے۔

۵ اس ملک کے قومی ترانے کا عنوان ہے: ''خدا! ملکہ کو حفاظت میں رکھے!'' اور اِس ملک کے قومی پرچم پر سفید زمین پر سُرخ رنگ کا پتّا نما نشان بنا ہوا ہے۔

جھوٹوں کے جھوٹے ⑲

۵۔ مختار ثقفی

حافظ محمد دانش عارفین حیرت۔ لاہور

مختار کو جب حملے کا علم ہوا تو وہ بھی مقابلے کے لیے نکلا، مگر اِس وقت اُس کے ساتھ اس کا بہادر سپہ سالار ابراہیم بن اشتر نہیں تھا، اور وہ اس کے ساتھ ہوتا بھی کیسے! وہ تو اُس کے دعویٰ نبوت اور دیگر بے سروپا باتوں کی وجہ سے اس سے علاحدگی اختیار کر چکا تھا۔

دونوں لشکروں کا سامنا ہوا اور جنگ شروع ہوگئی۔ ایک طرف ختم نبوت کی حفاظت کرنے والے سپاہی اور دوسری جانب جھوٹے اور کذاب کے پیروکار تھے۔ آخر ختم نبوت کے پروانے غالب آئے اور اُنھوں نے کذاب مختار ثقفی اور اُس کے ساتھیوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ یہ سب لوگ بھاگ کر ایک قلعے میں بند ہوگئے۔ ان کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔

ابھی یہ لوگ اپنی ہار سے سنبھل بھی نہیں سکے تھے کہ مختار کا ایک افسر قلعے میں آ کر شکایتی انداز میں کہنے لگا:

''آپ نے تو ہم سے فتح کا وعدہ کیا تھا اور بتایا تھا کہ ہم دشمن کو مار بھگائیں گے۔''

مختار نے یہ بات اپنے افسروں سے جنگ پر جانے سے پہلے کہی تھی۔ وہ اس طرح کی گفتگو کرنے کا عادی ہو چکا تھا، مگر اَب جب اسے شکست ہوئی تو اُس نے یوں بات بنائی:

''کیا تم نے وہ آیت نہیں پڑھی جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

'اللہ جس حکم کو چاہتا ہے ختم کر دیتا ہے اور جس حکم کو چاہتا ہے بحال رکھتا ہے اور اُسی کے قبضے میں ہے لوح محفوظ۔''

مختار کا یہ جواب سن کر اُس کے سپاہی خاموش ہوگئے۔

دوسری طرف مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ کئی دن تک چلتا رہا۔ نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ قلعے میں کھانے پینے کی چیزوں کی قلّت ہوگئی۔

یہ رمضان کا مہینا تھا۔ اس صورتِ حال میں مختار نے اپنے ساتھیوں کو دوبارہ جنگ کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ مختار نے اپنے ساتھیوں سے اپنے اسی اندازِ کرامات میں کہا:

''جس قدر زیادہ وقت گزرتا جائے گا اسی قدر تم لوگوں کی ہمت، کمزور ہوتی جائے گی، اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ ہم لوگ ہمت کریں اور جنگ کر کے اپنے دشمن پر فتح حاصل کریں۔''

اس کے ساتھیوں نے اس بات کی تائید نہیں کی اور مشورہ دیا:

''مصعب بن زبیر (رضی اللہ عنہ) سے جان کی امان طلب کرنی چاہیے۔ امید ہے کہ وہ ہمیں جان کی امان دے دیں گے۔''

مگر مختار نے اس مشورے کو قبول نہیں کیا اور جنگ کرنے پر بضد رہا۔ اس کے ساتھ صرف انیس لوگ راضی ہوئے اور اُنھوں نے باہر نکل کر حملہ کر دیا۔ مختار سمیت سب کے سب لوگ ۱۴، رمضان المبارک کو قتل ہوئے۔ جعلی نبی مختار ثقفی کو عبداللہ بن دجاجہ صیفی نے جہنم واصل کیا۔

.....☆.....

مختار کے قتل کے اگلے روز تمام لوگوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ان کی تعداد ایک ہزار سے چھے ہزار تک بیان کی جاتی ہے۔ یوں کوفہ مکمل طور پر فتح ہوگیا۔

کوفہ فتح کرنے کے بعد مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ابراہیم بن اشتر کو خط لکھا اور اُسے دعوت دی کہ وہ حکومت سے اتحاد کر لے۔ ابراہیم راضی ہوگیا اور اُس نے خلافت تسلیم کر لی۔ خلافت تسلیم کرنے پر مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اُسے اپنا سپہ سالار بنا لیا۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ بعض لوگ مختار ثقفی سے محبت کا دم بھرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ مختار نے اہل بیت سے محبت کی اور قاتلین حسین رضی اللہ عنہ کو انجام تک پہنچایا، اس لیے ہم بھی اس سے محبت کرتے ہیں اور مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نفرت کرتے ہیں کہ انھوں نے اسے قتل کر دیا۔

ایسے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ جب تک سیدنا عبداللہ بن زبیر اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما تک اس کا دعویٰ نبوت نہیں پہنچا تھا اس وقت تک انھوں نے حکومت کا باغی ہونے کے باوجود مختار ثقفی پر حملہ نہیں کیا تھا، بل کہ اسے قاتلین حسین رضی اللہ عنہ سے انتقام لینے دیا، لیکن جب ان تک اس کا دعویٰ نبوت پہنچا اور مختار ثقفی کے فتنے کا سدِّ باب کرنا ناگزیر ہو گیا تو اُنھوں نے وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس پر عمل کیا۔انھیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر مختار کو اِتنا ہی اہل بیت سے محبت کا زعم ہوتا تو وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو گرفتار کروانے کی کوشش کبھی نہ کرتا۔

مختار ثقفی کے اس عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اہل بیت سے محبت کا دَم صرف دکھاوے کی حد تک ہی بھرتا تھا۔حقیقت میں تو وہ حکومت کا طالب تھا۔اس کے یہ اچھے کام اس کے لیے اس کے دعویٰ نبوت کی وجہ سے کسی کام کے نہیں ہیں۔

مختار ثقفی کے جھوٹے بیانوں کی طرف حدیث شریف میں بھی پیش گوئی نظر آتی ہے۔چناں چہ ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''بنی ثقیف میں ایک کذاب پیدا ہوگا اور ایک مفسد پیدا ہوگا۔''

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ اس روایت کے مطابق کذاب، مختار تھا اور مفسد، حجاج بن یوسف تھا۔''

مسلم شریف میں ہے کہ حضرت اسماء (ذات النطاقین بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا) نے حجاج بن یوسف سے کہا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے فرمایا تھا:

'قبیلہ ثقیف میں ایک کذاب ظاہر ہوگا اور ایک مبیر (ہلاک کرنے والا)۔'

کذاب کو تو ہم نے دیکھ لیا، یعنی مختار ثقفی اور مبیر تُو ہے۔''

اسی طرح مستدرک، ابن خزیمہ، حاکم اور طبرانی میں عدی بن خالد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''میں تمھیں تین دجالوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہوں۔''

عدی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''آپ نے ہمیں دجال اور کذابوں کے متعلق تو اطلاع دی تھی۔اب یہ تیسرا کون ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''وہ ایک فتنہ ہوگا جسے لوگ نیک سمجھیں گے، حالاں کہ وہ ایسا دجال ہوگا جو سیاہ بھیڑیے سے بھی زیادہ خطرناک ہوگا۔آلِ محمد کی محبت ظاہر کر کے لوگوں کو گمراہ کرے گا، لیکن اسے میری سنت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوگا۔''

.....(جاری ہے).....

پیارا اپنا پاکستان

امان اللہ نیّر شوکت۔ لاہور

پیارا اپنا پاکستان
اس پر واری اپنی جان
اپنی دھرتی کے گُن گائیں
بوڑھے ، بچے اور جوان
پیارا اپنا پاکستان

جنگل جنگل ہریالی ہے
باغ میں پھول ہر اک ڈالی ہے
رُت بھی یاں پر متوالی ہے
دل کی راحت کا سامان
پیارا اپنا پاکستان

دیس کا اپنے نام کریں گے
دن اور رات ہر کام کریں گے
وقت پڑا تو اس کی خاطر
جانیں کردیں گے قربان
پیارا اپنا پاکستان

کتنا پیارا اپنا وطن ہے
بلبلیں ہم ، یہ اپنا چمن ہے
اس کے گُن گانے کی لگن ہے
اس کی بڑھائیں گے ہم شان
پیارا اپنا پاکستان

اس کا سبز ہلالی پرچم
ہو نہ سکے گا کسی سے یہ خم
اس کی عظمت دنیا مانے
قائم رکھیں اس کی آن
پیارا اپنا پاکستان

قرض

انسپکٹر احمد عدنان طارق۔ فیصل آباد

وہ بہت اندھیری رات تھی۔ سڑکیں ویران تھیں۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف فصلیں، جو صبح اپنے سبز اور رُوپہلی رنگوں سے آنکھوں کو تراوٹ بخشتی تھیں، رات کے اِس پہر اِسی تاریک رات کے بھیانک تاثر کو مزید گہرا کر رہی تھیں۔ کہیں دور کسی زمین دار کے پیٹر انجن کے چلنے کی کھٹ کھٹ کی آوازیں یوں آ رہی تھی جیسے دن کے وقت گاؤں میں آٹا پیسنے کی چکی چل رہی ہو۔ شاید رات کا ایک بج رہا تھا۔

یہ شہر سے بہت دور ایک مضافاتی علاقہ تھا۔ جہاں دن میں بھی زیادہ تر آمدورفت موٹر سائیکل سواروں کی ہی ہوتی تھی۔ مجھے یہاں ایس۔ ایچ۔ او لگے کوئی دو تین ماہ ہو گئے تھے۔ یہ تھانہ ایسی جگہ واقع تھا کہ قریبی قصبہ بھی یہاں سے کوئی پندرہ بیس کلومیٹر کی مسافت پر تھا، لہٰذا ہر شام ہی یہاں ویرانی چھا جایا کرتی تھی۔

گرمیوں میں رات کو سرکاری گاڑی میں گشت کرتے ہوئے اس کھلے علاقے میں ہوا لگتی رہتی اور میں شوق سے اس پر سوار رہتا۔ پرائیویٹ گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ زیادہ سے زیادہ دو کانسٹیبل اور ساتھ بیٹھ سکتے ہیں اور سرکاری گاڑی میں کئی۔ اس کے علاوہ کئی شہری تھانوں میں ہاتھ میں پکڑنے والے وائرلیس سیٹ سے گزارا ہو جاتا ہے، لیکن مضافاتی تھانوں میں سرکاری گاڑی میں لگے وائرلیس سیٹوں سے ہی گزارا ہوتا ہے۔ اس سے سارے ضلع کے تھانوں کے بارے میں معلوم ہوتا رہتا ہے۔

اس رات بھی معمول کے مطابق ہوا چل رہی تھی اور اَب مجھے نیند بھی آ رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور کو کہا کہ اب مجھے تھانے میں چھوڑ دے اور میری جگہ نئے آفیسر کو ساتھ لے لے۔

لیکن پھر دُور سے ایک فائر کی آواز نے اس سکوت کے طلسم کو توڑ دیا۔ میں فائر کی آواز پر چونکا، پھر میں نے سوچا کہ کوئی دیہاتی ہو گا جس نے تنہا بیٹھے بیٹھے فائر کر کے شاید چوروں کو تنبیہ کی ہے کہ میری طرف نہ آنا، میرے پاس بندوق ہے، لیکن پھر کئی فائر ہوئے اور مجھے احساس ہوا کہ کہیں چوری ہوئی ہے اور گاؤں والوں کی چوروں سے مڈبھیڑ ہو گئی ہے۔ ڈرائیور نے صرف ایک دفعہ میری طرف دیکھا اور پھر گاڑی کا رُخ اس طرف موڑ لیا جدھر سے فائرنگ کی آواز آ رہی تھی۔ سرکاری گاڑی میں پیچھے بیٹھے جوانوں کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب سرکاری گاڑی اچانک مڑے اور پھر کسی خاص سمت میں تیز رفتاری سے بڑھنے لگے تو وہ ذہنی طور پر تیار ہو جاتے ہیں کہ کچھ ہوا ہے، جس کی وجہ سے وہاں پہنچنا ضروری ہے۔

جلد ہی ہم منزل پر پہنچ گئے۔ گاؤں کے لوگ اکھٹے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں، جن کی نالیوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ چور آئے تھے، لیکن چوکی دار جاگ رہے تھے۔ ان کی وجہ سے گاؤں والے بھی جاگ اٹھے اور چور ناکام ہو کر بھاگ گئے۔

لیکن اس فائرنگ کے نتیجے میں ایک گولی پندرہ سالہ احسان کی ٹانگ پر لگ گئی تھی۔ احسان کے والدین نہیں تھے، وہ اپنی بوڑھی نانی کے پاس رہتا تھا۔ وہ پڑھتا نہیں تھا، بل کہ صبح سویرے اٹھتا اور اپنی اکلوتی بھینس کو چارہ ڈالتا، پھر اُس کا دودھ دوہتا۔ صبح کے کام مکمل کر کے وہ اپنی پیتل کی بالٹی لیتا، جس میں اس کی نانی نے تب تک آلو چھولے کی چاٹ بنا کر بالٹی بھر دی ہوتی۔

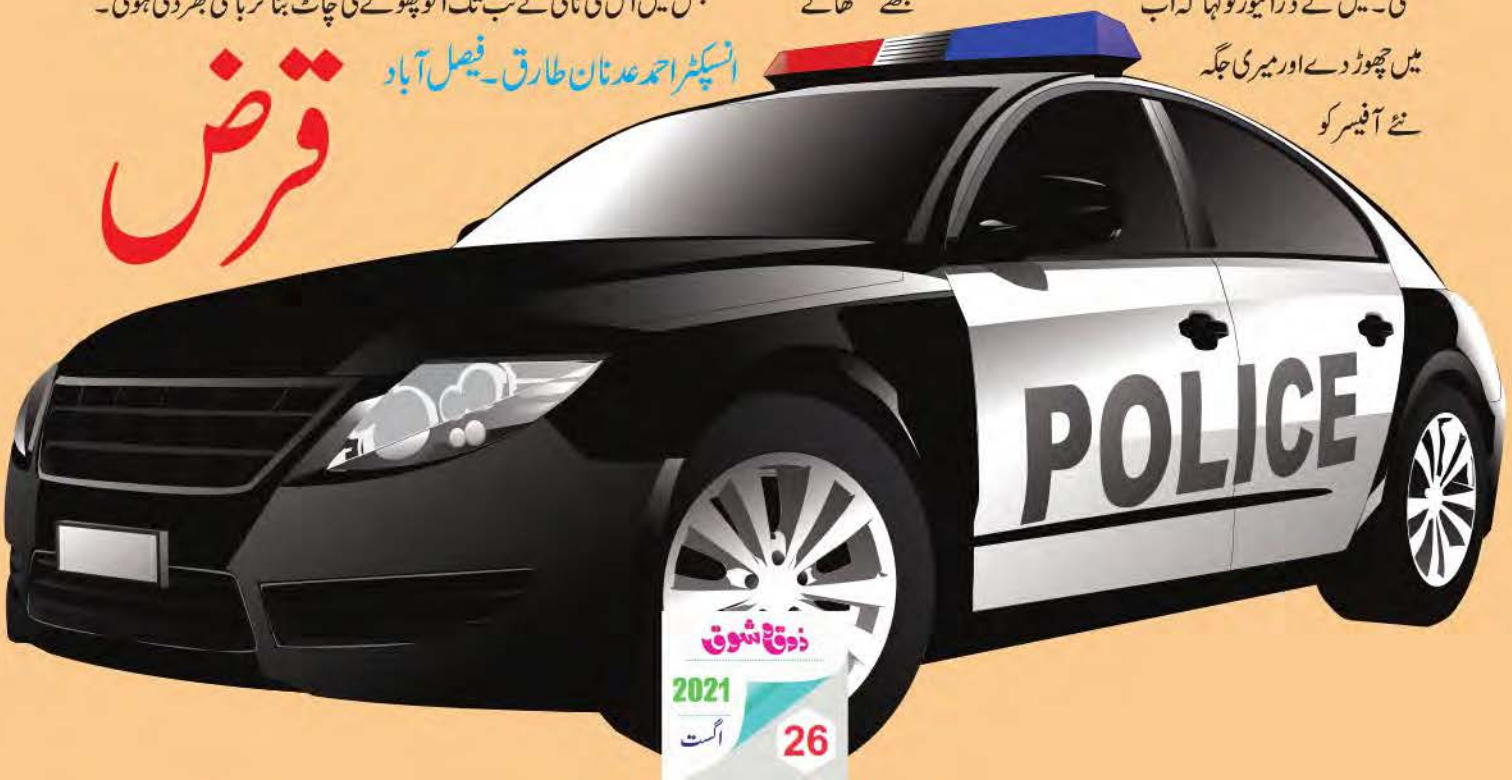

وہ گھر کے سامنے سے گزرتی ہوئی بس میں سوار ہوتا اور شہر کے بڑے سرکاری ہسپتال میں چل پھر کر وہ بالٹی والے آلو چھولے بیچتا اور شام کی گاڑی سے گھر کے سامنے اتر جاتا۔ اس کی بوڑھی نانی اس تھکے ماندے مزدور کو روٹی دیتی اور وہ دونوں خدا کا شکر اَدا کر کے سو جاتے۔

اس رات بھی احسان اپنے کچے مکان کے اکلوتے کمرے کی چھت پر سویا ہوا تھا اور نانی نیچے صحن میں تھیں۔ فائرنگ کی آواز سُن کر احسان اٹھا اور کوٹھے پر کھڑا ہو کر آنکھیں ملتا ہوا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ تاریک رات میں ایک اندھی گولی اس کی بائیں ٹانگ پر لگی اور وہ وہیں تیورا کر گر گیا۔ اس کی نانی بھی جاگ رہی تھیں۔ احسان کے منہ سے ہائے اماں نکلا تو اماں بے چاری کو اِتنا احساس ہو گیا کہ ضرور اِحسان کو کچھ ہوا ہے۔

احسان کو لگا جیسے اس کا دم گھٹ گیا ہے۔ اس نے آوازیں دیں، لیکن ایک منٹ تک اس کے حلق سے غوں نماں کے علاوہ کوئی آواز نہیں نکلی، پھر اُس نے پورا زور لگایا تو اُس کے منہ سے آہ و بکا نکلی اور لوگوں تک پہنچی۔

گاؤں والوں نے کوٹھے سے احسان کو اُتارا۔ میں جتنی جلدی وہاں پہنچ گیا، تھا شاید خدا کو اِحسان کی زندگی ابھی منظور تھی۔ احسان کی شلوار خون سے تر تھی۔ وہ چوٹ کے بعد جتنا شور مچا سکتا تھا مچا چکا تھا اور اَب خاموش تھا۔ میری نظروں کے سامنے معاذ کا چہرہ آ گیا۔ میرا بیٹا معاذ تب بارہ سال کا تھا۔

شاید کسی نے پولیس کو اَبھی تک فون نہیں کیا تھا، کیوں کہ میں خود بطورِ ایس۔ ایچ۔ او خود وہاں موجود تھا۔ مجھے اس وقت جو بات سوجھی وہ یہ تھی کہ میں نے احسان کو اُٹھایا، اس کی اماں کو سرکاری گاڑی میں بٹھایا۔ احسان کو لٹا کر اُس کا سَر اُس کی اماں کی گود میں رکھا اور ڈرائیور کو کہہ کر گاڑی قریبی قصبے کی طرف بڑھا دی۔ گاؤں کے دو نوجوان بھی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ایک قصبے سے دوسرے قصبے تک میں نے کیا کچھ کوشش نہیں کی، لیکن احسان کو کہیں سے طبی امداد نہیں ملی۔ آخر کار میں اسے شہر لے آیا اور اُسی سرکاری ہسپتال میں پہنچا دیا جہاں وہ آلو چھولے بیچتا تھا۔ یہاں پہنچ کر میں نے کنٹرول روم کو بھی فون کر دیا کہ میں اس کام میں مصروف ہوں اور وائرلیس کے بجائے وہ مجھ سے فون پر رابطہ کر سکتے ہیں۔

احسان کا چہرہ زرد پڑ چکا۔ اس کا کافی خون نکل گیا تھا، لیکن اب وہ ہسپتال میں تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا تو اُنھوں نے دوسرے اخراجات سے زیادہ ضروری خون دست یاب کرنے کو کہا۔ رات کے اڑھائی بج رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ احسان کا خون گروپ او۔ نیگیٹو تھا۔ ڈاکٹر صاحب پریشان ہو گئے، کیوں کہ او۔ نیگیٹو ایسا خون گروپ تھا جو بہت مشکل سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا چہرہ دیکھا تو اُنھیں میں پریشان نظر نہیں آیا۔ باقی لوگوں میں سے کسی گروپ اس سے نہیں مل رہا تھا، سوائے میرے۔ اس کی نانی کا ہو سکتا تھا، لیکن وہ بوڑھی اتنی تھیں کہ کسی نے انھیں چیک ہی نہیں کیا۔

جب میں اس کے ساتھ والے بیڈ پر لیٹا ہوا اُسے خون کی دوسری بوتل دے رہا تھا تو میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اب بھی مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے میں معاذ کا چہرہ دیکھ رہا ہوں۔ تبھی غیر محسوس انداز سے اس کی آنکھیں کھلیں۔ ایک دفعہ حیرانی سے اس نے میری طرف دیکھا، پھر دوسرے لوگوں کی طرف تو نانی نے اسے سارا واقعہ سنایا، اس طرح کہ جیسے کہہ رہی ہوں:

''بیٹا! کبھی اس احسان کو نہ بھولنا۔''

میں ہسپتال سے نکلا اور گاڑی میں بیٹھ کر خدا کا شکر اَدا کیا۔ مجھے دلی طور پر طمانیت سی محسوس ہوئی کہ میں نے کوئی اچھا کام کیا ہے۔ کئی دن بعد اِحسان اپنی نانی کے ہم راہ تھانے میں میرا شکریہ ادا کرنے آیا۔ وہ پھدک کر چل رہا تھا۔ مطلب تھا کہ اس دن اس کی ٹانگ کی ہڈی بچ گئی تھی۔ یہ واقعہ میرے لاشعور میں رہ گیا اور دو سال گزر گئے۔

.....☆.....

ایک جھپاکے سے میری آنکھیں کھلیں، جیسے کوئی ڈراؤنے خواب سے بیدار ہوتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ میں ہسپتال میں ہوں اور میرے بازو پر خون کی بوتل لگی ہوئی ہے۔ بے اختیار میری نظریں ساتھ والے بستر پر لیٹے ایک لڑکے پر پڑیں۔ اس کی نگاہوں کا رُخ بھی میری طرف تھا۔ وہ جانا پہچانا تھا۔ چند لمحوں میں، میں اسے پہچان گیا۔ وہ احسان تھا۔ وہ عمر میں تھوڑا بڑا لگ رہا تھا، لیکن منظر وہی تھا، وہی شہر کا سرکاری ہسپتال تھا اور ویسے ہی اس کے اور میرے بازوؤں میں خون کی بوتلیں لگی ہوئی تھیں، جن سے ایک کے جسم سے دوسرے کے جسم میں خون منتقل ہو رہا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور آنکھیں موند لیں۔ مجھے لگا جیسے احسان کو گولی لگی ہے اور میں اسے

خون دے رہا ہوں۔

لیکن پھر یک بارگی میں نے ہڑبڑا کر اُٹھنے کی کوشش کی تو میرے ساتھی پولیس آفیسر نے مجھے سنبھالتے ہوئے کہا:

''سر! آرام سے، ابھی اٹھنا نہیں ہے۔''

اور تبھی مجھے احساس ہوا کہ وہ لمحہ کئی سال ہوئے گزر چکا ہے اور شاید اب مجھے گولی لگی ہے۔ ہاں، مجھے یاد آیا، کل ہی میں نے منشیات فروشوں کے ٹھکانوں پر چھاپا مارا تھا۔ یہ تو وہ تھانہ ہے جہاں مجھے تعینات ہوئے ابھی کچھ ہی دن تو ہوئے ہیں۔ میرے باس نے مجھے اس تھانے میں تعینات کرتے وقت کہا تھا کہ تمھاری تعیناتی ان منشیات فروشوں کی سرکوبی کے لیے ہی کی جارہی ہے۔

میں گاؤں پوری تیاری ہی سے گیا تھا، لیکن ان کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ بھاگ نہیں سکتے تو اُنھوں نے فائرنگ کر دی تھی اور تبھی مجھے لگا جیسے میری بائیں ٹانگ میں کسی نے لوہے کی گرم سلاخ ڈال دی ہے۔ میں گرا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

میرے ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ سارے منشیات فروش مجرم پکڑے گئے ہیں اور اُن سے بے تحاشا منشیات برآمد ہوئی ہے۔ میرے باقی سب ساتھی پولیس آفیسر خیریت سے ہیں۔ پتا چلا کہ میرے آفیسر بے ہوشی کے عالم میں مجھے دیکھ کر گئے ہیں اور اُنھوں نے کہا ہے کہ جب میں ہوش میں آجاؤں تو مجھے مبارک باد دینا اور کہنا کہ بہت سے انعامات میرے منتظر ہیں۔

میری نگاہیں پھر احسان کی طرف اٹھیں تو میرے ساتھیوں نے حیرانی اور خوشی سے کی آمیزش میں مجھے بتایا کہ یہ لڑکا اس ہسپتال میں آلو چھولے بیچتا ہے۔ اس کی نظر تب آپ پر پڑی جب آپ اسٹریچر پر تھے اور سوچا جارہا تھا کہ اگر گولی اندر ہے تو پھر آپریشن کیا جائے۔ اس نے آپ کو دیکھا تو اِسی طرح آپ کا دُکھ محسوس کیا جیسے کوئی اپنے باپ کا کرتا ہے۔ یہ رات سے ادھر ہی ہے، گھر نہیں گیا۔ آپ کو دیکھتا رہا۔ جب آپ کو خون کی ضرورت تھی تو اِسے پورا اطمینان تھا کہ اس کا گروپ آپ سے ملتا ہوگا اور وہی ہوا۔ اس نے سر آپ کو دو بوتل خون دیا ہے۔

میں نے سوچا، دیا نہیں، لوٹایا ہے۔ اور میں کیوں اسے باپ نہ لگوں گا! مجھے بھی تو وہ بیٹا لگا تھا۔

اتنے میں وہ اٹھا، میرے ہاتھ کو چوما اور چل دیا۔ اس کی نانی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

کالی مرچ

سعد علی چھیپا۔ کراچی

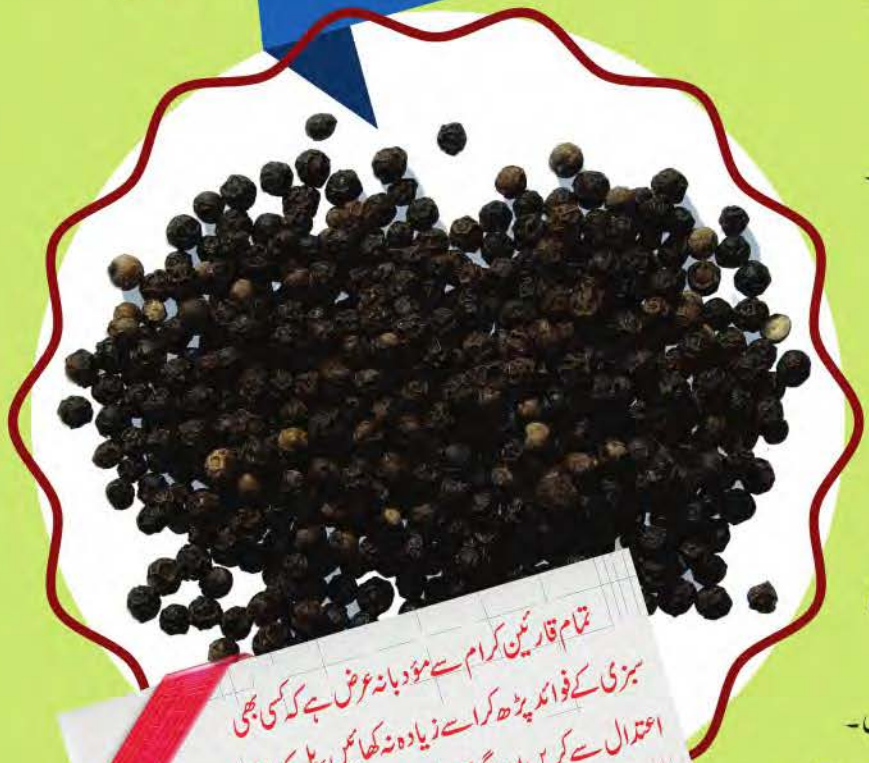

ہمارے گھروں میں شاید ہی کسی گھر کا باورچی خانہ ایسا ہو جہاں کالی مرچ نہ پائی جاتی ہو۔ کالی مرچ معروف ترین مسالوں میں سے ایک ہے اور ہمارے اکثر کھانوں کا حصہ بنتی ہے۔ کالی مرچ کی وجہ سے تیار کیے جانے والے کھانوں کا ذائقہ اچھا ہوجاتا ہے۔ کالی مرچ دراصل ایک پھل دار بیل ہوتی ہے۔ اسے خشک کرنے کے بعد مسالے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ کالی مرچ کا کھانوں میں استعمال صدیوں سے جاری ہے۔ یہ نہ صرف کھانے کا ذائقہ بڑھاتی ہے، بل کہ جسم کو کئی اقسام کی بیماریوں اور نقصان پہنچانے والے جراثیم سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ قبل از مسیح سے اسے ادویاتی طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔

کالی مرچ کے فوائد:

☆ کالی مرچ جگر اور دِماغ کو تقویت دیتی ہے۔

☆ کالی مرچ سے انسانی معدے میں گیس بننے کا عمل بہت کم ہوجاتا ہے۔

☆ کالی مرچ دمہ، کھانسی، زکام اور بدہضمی میں نہایت مفید ہے۔

☆ کالی مرچ میں سرطانی رسولیوں کے خلاف مزاحمت پائی جاتی ہے۔

☆ کالی مرچ انسانی معدے میں ہائیڈروکلورک ایسڈ کے اخراج میں اضافہ کرتی ہے، جس سے ہاضمے کا عمل بہتر ہوجاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ معدے کی تیزابیت اور قبض کی شکایت کو دُور کرتی ہے۔

☆ کالی مرچ جراثیم کے خلاف اپنی خصوصیات کے سبب امتیازی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ آنتوں کو متاثر کرنے والے جرثومی امراض کے علاج میں مدد کرتی ہے۔

☆ کالی مرچ سے اعصابی نظام تیز ہوتا ہے اور پیٹ کے کیڑے مرتے ہیں۔

☆ کالی مرچ کھانے سے جسم میں پسینہ بنتا ہے، جس سے جسم کا درجہ حرارت کم ہوجاتا ہے۔

☆ کالی مرچ میں اینٹی آکسیڈنٹ، اینٹی سیپٹک، اینٹی فنگل اور اینٹی ٹیومر خصوصیات ہوتی ہیں۔

☆ کھانے میں لذت کا اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ کالی مرچ کھانے کی خواہش میں بھی اضافہ کرتی ہے۔

☆ کالی مرچ مختلف تیل اور کیمیکلز کی وجہ سے جسم میں بننے والے اسہال یا ڈائریا کے اثرات کو کم کرتی ہے۔

☆ اگرچہ کالی مرچ کھانے کی رغبت کو بڑھاتی ہے، تاہم اس کے باوجود یہ وزن کم کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ کالی مرچ کی بیرونی تہ چربی والے خلیوں کو توڑنے کے لیے حرکت میں لاتی ہے، جس سے اچھی صحت برقرار رکھنے میں مدد ملتی ہے اور بہتر طور پر چربی کو گھلانے کے لیے مسلسل توانائی فراہم ہوتی ہے۔

ان تمام امور کے باوجود ہمارے پکوانوں میں کالی مرچ کی مقدار معتدل ہونی چاہیے، اس لیے کہ کالی مرچ کی زیادتی معدے اور آنتوں کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ہر چیز میں اعتدال ہمیشہ سے بہتر ہوتا ہے۔

درد گردہ کی بیماری میں مبتلا مریضوں کو کالی مرچ کا استعمال مناسب نہیں۔ گرم مزاج والے لوگ کم سے کم استعمال کریں۔

تمام قارئین کرام سے مؤدبانہ عرض ہے کہ کسی بھی سبزی کے فوائد پڑھ کر اسے زیادہ نہ کھائیں، بل کہ اس کا استعمال اعتدال سے کریں اور اگر آپ کو کوئی خاص بیماری ہے تو اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کرکے کوئی بھی غذا استعمال کریں۔

جادو کا چراغ

تنزیلہ احمد۔ اوکاڑہ

دن کب کا چڑھ چکا تھا اور وہ ابھی تک اوندھے منہ پڑا سو رہا تھا۔

''اٹھ بھی جاؤ! اور کتنا سونا ہے؟ اسکول نہیں جانا کیا؟''

بانو بیگم نے بلا مبالغہ کوئی دسویں بار اُسے پکارتے ہوئے اس کے کندھے جھنجھوڑے۔

مگر مجال ہے اس پر کچھ اثر ہوا ہو۔ کوئی اور دن ہوتا تو وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتیں، مگر آج وہ ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو اُنھوں نے پانی کا گلاس اس پر اُنڈیل دیا۔

اس اچانک افتاد پر وہ یک دم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

''اماں! آج مجھے نہیں نہانا تھا!'' اپنی حالت دیکھ کر اُس نے منہ بسورا۔

''پتر جی! یہ بات تم پچھلے ایک ہفتے سے کہہ رہے ہو۔ ہفتے کے دن ختم ہو جاتے ہیں، مگر تمھارا نہانے والا دن نہیں آتا۔'' انھوں نے کہا اور ساتھ ہی ہاتھ سے غسل خانے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔

صبح صبح اس کی کھنچائی ہو گئی تھی۔ بُرے بُرے منہ بناتا وہ بستر سے اٹھا۔ اس کا اتنا اچھا خواب ایک گلاس پانی بہا لے گیا تھا۔ ابھی تو اسے اپنی تین خواہشیں پوری ہوتی دیکھنی تھیں پر.....

آج اس کا پہلا پرچہ تھا اور بانو بیگم دل سے دعا کر رہی تھیں کہ اس مرتبہ سالانہ امتحان میں ان کا نام کا لائق فائق بیٹا پاس ہو جائے۔ گزشتہ دو برس سے وہ لگاتار پانچویں جماعت میں فیل ہو رہا تھا۔

اس کے ابو سبزی منڈی میں کام کرتے تھے۔ صبح سویرے ہی وہ سبزی منڈی چلے جاتے۔ بیٹے کی نالائقی اور سستی پر والدین کا دِل تو بہت کڑھتا، مگر اُنھوں نے اس کے لیے پیار اور شفقت میں فرق نہیں آنے دیا تھا۔ بانو بیگم ہمیشہ اسے پیار سے سمجھاتیں اور کبھی ڈانٹتیں بھی، مگر اُس پر کوئی خاص اثر نہ ہوتا۔ وہ اس کے ساتھ مار پیٹ اور بہت سختی سے پیش نہ آتیں کہ کہیں وہ ان سے بدظن نہ ہو جائے۔

آدھے گھنٹے بعد نہا دھو کر اِسکول کا لباس پہنے وہ الماری میں گھسا ہوا تھا۔ اپنی من پسند چیز نکال کر اُس نے الماری بند کی۔ اس کے ہاتھ میں موجود چیز پیتل کا ایک پرانا سا چراغ تھا، جو اُسے دو ڈھائی برس پہلے ایک کباڑیے کی دکان سے ملا تھا۔

کہانیاں پڑھ پڑھ کر پتا نہیں کیسے اس کے دماغ میں یہ سما گیا تھا کہ یہ چراغ وہی ہے جسے رگڑنے سے ایک روز جن نکلے گا اور وہ پوچھے گا: ''کیا حکم ہے میرے آقا!؟'' پھر وہ ٹھک سے اپنی خواہشیں بتا کر سب کچھ حاصل کر لے گا، جس کی وجہ سے دنیا اس پر رشک کرے گی۔

''بس کر دو اِسے رگڑنا۔ یہ گھس تو جائے گا، مگر اِس میں سے کچھ نکلے گا نہیں۔ کچھ ہو تو نکلے نا! چلو جلدی آجاؤ، ناشتا تیار ہے۔ آج اچھا اچھا پرچہ دینا میرے پتر!'' بانو بیگم نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلا دِیا۔

والدین نے بہت شوق سے اس کا نام فائق رکھا تھا، مگر حقیقت میں وہ اپنے نام کے برعکس تھا۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ پہلے تو پھر بھی وہ کچھ پڑھ لیتا تھا، مگر جب سے اسے چراغ ملا تھا اس کی عادتیں عجیب ہو گئی تھیں اور وہ مزید سُست ہو گیا تھا۔

ایک بار اُس کے اسکول میں کھیلوں کا مقابلہ منعقد ہوا۔ پڑھائی تو ہونی نہیں تھی، اس لیے وہ چراغ کو بہت چاہت سے اپنا اسکول

دکھانے لے گیا۔ چراغ اس کا اسکول اور جماعت کیا دیکھتا، مگر اُس کے ہم جماعتوں نے اس کے چراغ کو خوب اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔

تبھی سے سب دوستوں نے اس کا نام جادو رکھ دیا تھا۔ اس کا چراغ پورے اسکول میں ''جادو کا چراغ'' کے نام سے مشہور تھا اور پیتل کے پرانے چراغ کو رگڑنا ''جادو'' کا محبوب مشغلہ۔

فائق سست اتنا تھا کہ کوئی بھی کام کرتے ہوئے اسے محاورۃً موت آتی، اس لیے چراغ کے جن کی اسے بہت شدت سے آرزو تھی کہ کوئی غلام جن ہو اور وہ بس حکم صادر کرتا رہے اور پلک جھپکتے تمام کام ہوتے چلے جائیں۔

غلام جن کو اپنے اشارے پر نچانے کے خیالات وہ سبھی کو خوب مرچ مسالے لگا کر سناتا۔ سب لوگ اس کی ان باتوں پر خوب ہنستے۔

خیر، وہ پرچہ دینے اسکول پہنچا تو ہمیشہ کی طرح سب نے اسے گھیر لیا۔

''کیوں بھئی جادو! چراغ سے کوئی جن وِن نکلا؟ تمھیں تو پتا ہوگا پرچے میں کیا آئے گا! لگتا ہے اس بار ہمارا جادو سب سے زیادہ نمبر لے کر سب کے سر چڑھ کر بولے گا۔''

اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا، اس لیے وہ خاموش ہی رہا۔

امتحان ختم ہوئے اور نتیجہ نکل آیا۔ وہی ہوا جس کا سب کو یقین تھا۔ جادو کا جادو نہیں چل پایا تھا۔

پانچویں جماعت میں وہ مسلسل تیسری مرتبہ ناکام ہو چکا تھا۔

''کہانیوں میں تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ سب ٹھیک ہو جاتا ہے، مگر میرے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوا؟''

امتحان میں تیسری بار ناکامی پر بارہ سالہ فائق رات دیر تک روتا رہا۔ سبھی کہانیاں اور اُن کے انجام ذہن میں سوچتے ہوئے خوب کڑھتا رہا۔ چراغ سے نہ نکلنے والے جن نے اسے بہت مایوس کیا تھا۔

اس کے ساتھی اگلی جماعتوں میں پہنچ چکے تھے۔ وہ اسے جہاں دیکھتے ہنسنے لگتے اور چہ مگوئیاں کرتے۔

''جادو کا چراغ! وہ دیکھو جادو.....'' کہہ کر اُس کا مذاق اڑاتے۔

فائق عرف جادو بڑا ہوتا رہا اور اُس کا چراغ گھس گھس کر پتلا ہوتا گیا۔

لیکن پھر اچانک کچھ دنوں میں گھر والوں سمیت دوستوں اور اساتذہ نے بھی اس کے رویے میں واضح بدلاؤ محسوس کیا۔

''ارے اجادو! کیا بات ہے؟ کئی دنوں سے چراغ کی کوئی کہانی نہیں سنائی۔ کہیں چوری تو نہیں ہو گیا؟'' آدھی چھٹی ہوئی تو ایک شرارتی ہم جماعت نے اسے چھیڑا۔

''میرا نام لائق ہے، سمجھے! آئندہ مجھے اسی نام سے پکارنا۔'' سپاٹ لہجے میں کہہ کر وہ تھوڑی دور جا بیٹھا۔

یہ اس ہم جماعت کے لیے حیرت کا پہلا جھٹکا تھا۔

دوسرا جھٹکا سب کو تب لگا جب ہر کاپی پر اُس کا اسکول کا کام مکمل ملا۔

تیسرا جھٹکا تب لگا جب اس نے ٹیسٹ میں اچھے نمبر حاصل کیے۔

آہستہ آہستہ ان سب کو ایسے جھٹکوں کی عادت ہوتی چلی گئی۔

دن گزرتے گئے، بالآخر سالانہ امتحان سر پر آ گئے، ایک ایک کر کے تمام پرچے ہوئے اور پھر چھٹیاں ہو گئیں۔

آخر کار نتیجے کا دن آ پہنچا۔ جس کا اسے شدت سے انتظار تھا۔

''کیا بات ہے بھئی، آج چراغ کے در پر حاضری نہیں دینی کیا!؟'' بانو بیگم نے اسے تیار دیکھ کر مسکراتے ہوئے ذومعنی انداز میں پیار سے چھیڑا تو وہ جھینپتے ہوئے ان کے گلے لگ گیا۔

''نہیں اماں!''

''میرے پیارے پتر! شکر ہے تمھیں عقل آئی کہ حقیقی چراغ تو اِنسانی ذہن ہے، جسے روشن رکھنا اور بہتر طور پر اِستعمال کرنا ہی اصل جادو ہے۔'' لاڈ سے انھوں نے اس کے سر پر بوسہ دیا۔

گو کہ وہ کافی عرصے پہلے ہی اس کی چراغ میں عدم دل چسپی محسوس کر چکی تھیں، مگر اُس سے کبھی پوچھا نہ تھا۔ ان کا لاڈلہ سدھر گیا تھا، ان کے لیے یہی کافی تھا۔

حسبِ توقع فائق اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا اور وہ سب حیران پریشان تھے، جو اُسے نکھٹو اور نالائق سمجھتے تھے۔

فائق بہت خوش تھا۔ اسے سمجھنے میں تھوڑی دیر لگی، مگر بالآخر وہ سمجھ گیا تھا کہ اصل جادو اور جن، پیتل کے چراغ میں نہیں، بل کہ اس کے پاس ہے۔

کام یابی کا ایسا گُر جو اللہ تعالیٰ نے ہر اِنسان کے ہاتھ میں رکھا ہے، اور وہ ہے محنت کا جادو!

کوشش اور محنت کا ایسا جن جسے قابو کرنے کے لیے کسی چراغ کی ہرگز ضرورت نہیں پڑتی۔ ضرورت ہوتی ہے تو بس نیک نیتی سے محنت اور کوشش کرتے رہنے کی۔

اور فائق نیک نیتی سے محنت اور جدوجہد کرنا سیکھ چکا تھا۔

تاریخی جھانکیاں

اوروں کے گھر بسانے والا

محمد حذیفہ رفیق زم زمی۔ کراچی

وہ اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی جارہی تھی۔ ایک قدم اسے امید دِلاتا اور اگلے قدم میں مایوسی کے بادل اس کے سر پر منڈلانے لگتے۔ اس کا رُخ اسلامی خلافت کے دارالخلافت دمشق کی جانب تھا۔

وہ عراق کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی۔ وہ سوچتی جارہی تھی کہ بھلا امیر المومنین تک پہنچنے کی کیا صورت ہوگی، کیوں کہ امیر المومنین کے محل کے باہر تو کڑی پہرے داری ہوگی، مجھ جیسی غریب عورت کا تو وہاں سے گزرنا بھی مشکل ہوگا اور پھر خلیفہ بھی وہ جس کے رعب اور دبدبے کا مشرق و مغرب میں چرچا ہے۔ میں بھلا کیسے ان تک پہنچ سکوں گی؟ وہ ان ہی سوچوں اور خیالات میں گم اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

دمشق کے قریب پہنچ کر وہ لوگوں سے پوچھنے لگی کہ امیر المومنین سے ملاقات کیسے ہوسکتی ہے؟ ہر ایک یہی کہتا:

''اماں! چلی جاؤ، تمھاری ملاقات ہوجائے گی۔''

اس کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسے ہوگا؟ ایک خوف سا تھا کہ نجانے میری فریاد پوری ہوگی یا خالی ہاتھ لوٹنا پڑے گا۔ اس بڑھاپے میں پانچ کنواری بچیوں کو گاؤں میں اللہ کے نام پر چھوڑ کر آئی ہوں۔ اگر یہاں سے مایوسی ہوئی تو پھر کہاں جاؤں گی؟

جب وہ یہ سوچتی اور اُسے اپنی پھول جیسی پانچ بچیوں کا خیال آتا اور اُن کی معصوم شکلیں دل و دماغ میں گردش کرتیں تو وہ تصور کی دنیا میں دمشق سے ہزاروں کلومیٹر دُور عراق کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے معمولی مکان میں اپنی بچیوں کو کھیلتا ہوا دیکھتی۔ کبھی ماں کی یاد میں انھیں روتا ہوا دیکھتی۔ کبھی بھوک سے پریشان ان کے چہروں کی افسردگی دیکھتی اور وہ اپنی آنکھوں پر ضبط نہ کرسکتی اور آبدیدہ ہوجاتی۔ کبھی کبھار جب حالت برداشت سے باہر ہوجاتی تو کسی گلی کوچے میں، کسی کونے میں بیٹھ کر بلک بلک کر روتی اور اَپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرلیتی، پھر اللہ سے دعا مانگتی، کیوں کہ اسے اپنے رب پر پورا بھروسا تھا، جس نے اسے زندگی کے کسی موڑ پر تنہا نہیں چھوڑا تھا۔

اللہ رب العزت کے سہارے اور آسرے کے بعد اُسے امیر المومنین سے امید تھی، کیوں کہ اس نے کئی معتبر لوگوں سے سنا تھا کہ وہ بہت نوازنے والا ہے۔ غریبوں سے محبت اور ہمدردی کرتا ہے۔

لیکن اس کا دل قبول نہیں کر پا رہا تھا، کیوں کہ اس نے سالوں سے خلفا کے جو حالات سنے تھے وہ ایسے نہیں تھے، مگر کہنے والے کہتے تھے کہ ایک ڈیڑھ سال سے جو نیا خلیفہ آیا ہے وہ انتہائی رحم دل ہے۔

یہ سب کچھ سننے کے باوجود بھی وہ پوری طرح مطمئن نہیں تھی، بل کہ کش مکش کا شکار تھی۔ اسی کش مکش میں وہ چلی جارہی تھی اور لوگوں سے پوچھتی بھی جارہی تھی، لیکن جب وہ خلیفہ کی رہائش گاہ کے قریب پہنچی تو اُس کا گمان یقین میں بدلنے لگا، جو سنا تھا وہ سچ بن کر نظروں کے سامنے جھلکنے لگا۔

اب خلیفہ کی رہائش گاہ اس کے بالکل سامنے تھی۔ وہ کوئی محل، عمدہ کوٹھی یا کوئی عالی شان مکان نہیں تھا، بل کہ مٹی گارے کا انتہائی سادہ اور معمولی انداز کا مکان تھا۔ اس نے ایک راہ گزر سے پوچھا:

''کوئی پہرے دار بھی ہے اس گھر کا؟''

''اس گھر کا کوئی پہرے دار نہیں ہے، جانا چاہو تو اَندر چلی جاؤ!'' اس

نے لاپروائی سے جواب دیا۔

اب کسی حد تک اسے یقین آنے لگا کہ جو باتیں وہ عراق سے سنتی ہوئی آ رہی ہے وہ کچھ کچھ نہیں، بل کہ ساری کی ساری ہی درست ہیں۔ بہر حال، وہ اندر چلی گئی۔ وہاں خلیفہ وقت کی اہلیہ فاطمہ بنت عبدالملک بیٹھی تھیں۔

یہ وہ خاتون ہیں جو خلیفہ وقت کی اہلیہ تھیں اور اُن کے والد اور دو بھائی (ولید بن عبدالملک اور سلیمان بن عبدالملک) پہلے خلیفہ بن چکے تھے اور دو بھائی (یزید بن عبدالملک اور ہشام بن عبدالملک) ان کے شوہر کے انتقال کے بعد خلیفہ بنے، اس اعتبار سے کئی نسبتوں سے شہزادی اور ملکہ ہیں۔

بِنْتُ الْخَلِيفَةِ وَالْخَلِيفَةُ جَدُّهَا
أُخْتُ الْخَلَائِفِ وَالْخَلِيفَةُ زَوْجُهَا

(خلیفہ کی بیٹی، اور دادا بھی خلیفہ، (چار) خلفا کی بہن اور شوہر بھی خلیفہ۔)

تاریخ میں ان کی مثال نہیں ملتی، لیکن سادگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہاتھ سے کپڑا بُن رہی تھیں۔

اس عورت نے سلام کیا، فاطمہ بنت عبدالملک نے جواب دیا اور اَندر بلا کر بٹھایا۔

وہ گھر میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اسے دنیا کے ساز و سامان میں سے کچھ نظر ہی نہ آیا۔ کچا سا مکان، آرائش و آسائش کے اسباب سے یک سَر خالی، بل کہ ضرورت کی بھی بہت سی چیزیں یہاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔

یہ منظر دیکھ کر اُس کے منہ سے نکلا:

''جس کا اپنا گھر خالی ہے وہ میرا گھر کیسے بھرے گا؟''

فاطمہ بنت عبدالملک نے کہا:

''اماں! آپ جیسوں کے گھروں کو بھر بھر کے ہی انھوں نے اپنا گھر خالی کر دیا ہے!

اماں! فکر مت کرو، اس گھر والے نے اپنا گھر خالی کر کے آپ جیسے بہت سوں کے گھر بسائے ہیں!''

اتنے میں ایک آدمی گھر کے اندر آیا اور آتے ہی کنویں سے پانی نکال کر مٹی پر ڈال کر دیوار لیپنے کے لیے گارا تیار کرنے لگا۔ وہ ہر تھوڑی دیر بعد مڑ کر فاطمہ بنت عبدالملک کو دیکھتا۔

اس عورت نے فاطمہ بنت عبدالملک سے کہا:

''تم اس آدمی سے ذرا احتیاط کرو، یہ مزدور بار بار تمھیں دیکھ رہا ہے!''

فاطمہ نے کہا:

''اللہ تجھ پر رحم کرے! یہ مزدور نہیں ہے، یہی تو امیر المومنین ہیں!''

یہ سن کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ رعب کے مارے اس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ اب وہ خاموش ہو کر اَمیر المومنین کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

امیر المومنین اطمینان سے تشریف لائے۔ گھر میں ایک چھوٹی سی جگہ تھی، جہاں امیر لمومنین کی جائے نماز بچھی رہتی تھی۔ گھر میں اسی جگہ نماز اَدا فرمایا کرتے تھے۔ آپ اس جگہ تشریف لائے اور آپ نے اپنے گھر والوں سے پوچھا کہ یہ عورت کون ہے؟

انھوں نے بتایا کہ یہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔

آپ نے اسے بلا لیا۔ آپ کے پاس کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی ایک ٹوکری تھی۔ اس میں انگور کے خوشے تھے۔ آپ نے اچھے اور صاف دانے نکال کر اُس عورت کو پیش کیے، پھر آنے کا مقصد دریافت کیا۔

اس نے کہا:

''میں عراق کی ایک غریب عورت ہوں۔ میری پانچ کنواری بچیاں ہیں۔ ان کا کوئی رکھوالا نہیں ہے۔ کوئی ان سے بیاہ کرنے کو تیار نہیں، میری بچیاں آپ کے دست شفقت کی محتاج ہیں۔ میں عراق سے چل کر آپ کی خدمت حاضر ہوئی ہوں۔ آپ کے احسان کی امید اور آس لے کر آئی ہوں۔ خدارا! میری بچیوں کے لیے کچھ کر دیجیے۔''

وہ سراپا التجا اور فریاد بن کر بولتی چلی جا رہی تھی، لڑکھڑاتی زبان سے، کپکپاتے ہاتھوں اور ٹمٹماتی آنکھوں سے۔

امیر المومنین بھی اس کی فریاد سُن کر اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے، آبدیدہ ہو گئے اور اُس عورت کے جملے دہرانے لگے:

''ان کا کوئی رکھوالا نہیں ہے! ان سے کوئی بیاہ کرنے کو تیار نہیں ہے!''

پھر آپ نے کاغذ اور قلم لیا اور والی عراق (عراق کے گورنر) کے نام خط لکھنا شروع کیا۔ عورت سے کہا:

''سب سے بڑی بیٹی کا نام بتاؤ۔''

اس نے نام بتایا تو اُنھوں نے ایک بڑی مقدار مال کی اُس کے نام لکھ دی۔

اس عورت کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! (تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، اس کا شکر ہے!)''

انھوں نے دوسری کا نام پوچھا۔ اس نے نام بتایا تو اُس کے نام بھی ایک بڑی مقدار لکھ دی۔

دوبارہ اس عورت نے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہ!''

اس کے بعد تیسری کا نام پوچھ کر لکھ دیا، تب بھی اس نے یہی کہا، پھر چوتھی کا نام پوچھا اور یہی ہوا۔

جب چاروں کو بہت بڑی بڑی مقدار مال کی لکھ دی تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور اُس نے فرطِ خوشی میں عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو دُعائیں دینا شروع کر دیں اور اُن کی تعریف کرنے لگی۔

یہ سن کر عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ کھینچ لیا اور فرمانے لگے:

''اب ہم تمھارے لیے کچھ نہیں لکھ سکتے۔ جب تک تم اس ذات کی تعریف کرتی رہیں جو تعریف کی مستحق ہے، ہم تمھارے لیے مقدار مقرر کرتے رہے، لیکن اب کچھ نہیں لکھیں گے۔ ان چاروں کو کہنا کہ اپنے اپنے حصوں میں سے تھوڑا تھوڑا اِس پانچویں کو دے دیں۔''

وہ عورت رقعہ لے کر وہاں سے واپس ہوگئی۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اور اُس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی!

کیا تصورات لے کر آئی تھی وہ، اور اَب اپنے سپنوں کو حقیقت کی شکل میں دیکھ رہی تھی!

اس دنیا میں سب سے قیمتی چیز اُس کی نظر میں وہ خط تھا، جسے وہ تھامے جا رہی تھی!

اس خط کو لے کر اُس کی ٹانگوں میں جوانی کی طاقت لوٹ آئی تھی اور اُس کے چہرے پر نئی تازگی ابھر آئی تھی!

جب وہ دمشق آ رہی تھی تو اُس کے چہرے پر غم، فکر اور پریشانی کے آثار تھے اور واپسی کے سفر میں وہ خوشی کے آنسوؤں سے اشک بار تھی۔

وہ خیالات کی دنیا میں اب اپنی بچیوں کو ہنستا کھیلتا دیکھ رہی تھی!

اسی دھن میں وہ تیزی سے منزلیں طے کرتی چلی جا رہی تھی، یہاں تک کہ عراق شہر میں پہنچ گئی۔

والی عراق کے سامنے پہنچ کر اُس نے خلیفہ کا خط پیش کیا۔ گورنر نے خط کھولا، پڑھنا شروع کیا۔ امیر المومنین خلیفہ وقت ''عمر بن عبدالعزیز'' کے نام پر جب وہ پہنچا تو اُس کے آنسو نکل آئے اور اُس نے رونا شروع کر دیا۔ روتے روتے اس کی آواز بلند ہوگئی اور ہچکیاں بندھ گئیں۔ بڑھیا پریشان ہوگئی، لیکن کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ والی عراق کے منہ سے نکلا:

''اللہ تعالیٰ اس خط کے لکھنے والے پر رحم کرے!''

یہ سن کر بڑھیا کے اوسان خطا ہوگئے، اس نے بے خود ہو کر کہا:

''کیا ان کا انتقال ہوگیا ہے؟''

والی عراق نے کہا:

''ہاں!''

یہ سن کر بڑھیا کی چیخ نکل گئی اور اَب وہ بھی رونے لگی۔

لیکن اس کے رونے کی وجہ کچھ اور تھی۔ اصول یہ کہہ رہا تھا کہ اب خلیفہ کا انتقال ہو چکا ہے، اس لیے اب ان کے فرمان کی کوئی حیثیت نہیں رہی، اب ان کا فرمان کالعدم ہے، لیکن عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ایسی شخصیت نہیں تھے کہ اتنی جلدی ان کے آثار اور اُن کی وقعت دلوں سے نکل جائے، بل کہ تاریخ گواہ ہے کہ آج تیرہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی ان کا ذکر اُسی طرح معطر اور منور ہے۔

والی عراق نے کہا:

''اماں، آپ کیوں گھبراتی ہیں!؟ خلیفہ کا یہ خط ہو بہو پورا کیا جائے گا! ہم اتنی جلدی اپنے امام کو بھولنے والے نہیں ہے؟''

سلام ہے اس پر جس نے مرتے مرتے بھی نہ جانے کتنی بیواؤں کو سہارا دِیا، کتنے یتیموں کی کفالت کی، کتنے ہی اجڑے ہوئے گھر آباد کیے اور کتنے مرجھائے ہوئے چہروں کو زندگی کی تر و تازگی عطا کی!

اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے گھر کا دِیا بجھا کر لاکھوں دیے جلا دیے۔

خوش خبری

مقابلۂ خوش خطی ۱۲

طلباوطالبات کے لیے انعامات جیتنے کے مواقع

بارہ مہینے
بارہ انعامات

انعامات:

اول آنے پر 1000 روپے / دوم آنے پر 700 روپے

سوم آنے پر 500 روپے

مقابلے میں شریک ہونے کے لیے مندرجہ ذیل فن پارے کو لکھیے۔ جو قاری اس فن پارے کو عمدہ انداز میں لکھنے میں کام یاب ہو گیا، وہ انعام کا حق دار ہوگا۔

تو پھر دیر کس بات کی! اٹھائیے کاغذ اور قلم، کیجیے مشق.....اور ہمیں جلد از جلد ارسال کر دیجیے۔

مقابلے سے متعلق ضروری ہدایات:

☆ کمپیوٹر پیپر (A-4 سائز) صفحہ استعمال کیجیے۔

☆ فن پارے کو لکھنے کے لیے فونٹین پین، پنسل، کٹا ہوا پین اور کٹا ہوا مارکر استعمال کر سکتے ہیں۔

☆ کالی اور نیلی روشنائی استعمال کیجیے، کوئی اور رنگ بالکل استعمال نہ کیجیے۔

☆ صفحے کے چاروں جانب سے تقریباً ایک ایک اِنچ کا فاصلہ رکھ کر نمونہ تحریر کیجیے۔

زیرِ انتظام
شعبۂ خوش خطی، البدر ہائر سیکنڈری اسکول

جنّت الفردوس

نوٹ: فن پارہ ۳۱ اگست ۲۰۲۱ء تک ہمیں موصول ہو جانا چاہیے۔ ایک فن پارہ ایک طالب علم کی طرف سے قبول کیا جائے گا۔ کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا، جس پر اعتراض قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ مقررہ تاریخ کے بعد وصول ہونے والے فن پارے مقابلے میں شریک نہیں کیے جا سکیں گے۔

نام ہے میرا شرشر

فاتح کون ۲

۱

نذیر انبالوی۔ لاہور

ہر طرف دھول ہی دھول تھی۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

جھوٹ زخمی حالت میں ایک طرف پڑا تھا۔ نفرت کی حالت بھی بہت تشویش ناک تھی۔ گھمنڈ نے آنکھیں کھولیں تو ہر طرف بدی پورہ کے مکین زخمی حالت میں پڑے تھے۔

ملکہ بدی بھی خون میں لت پت تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ نیکی نگر والوں نے انھیں شکست سے دوچار کر دیا ہے۔

"میں ہار نہیں مانوں گی میں انتقام لوں گی، ایک ایک بات کا بدلہ لوں گی۔"

ملکہ بدی کا یہ جملہ سُن کر ایک سیاہ رنگت والا ہیولا نمودار ہوا۔ اس نے ملکہ بدی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا:

"میں آ گیا ہوں۔ میں شیطان ابن شیطان ہوں۔ شیطان اعظم نے مجھے بدی پورہ کے مکینوں کی مدد کے لیے بھیجا ہے۔ سب اٹھو، ہمت کرو، دوبارہ بدی کا جہاں آباد کرو، بہت سے انسان تم سب کے منتظر ہیں۔ میں تم سب کے ساتھ ہوں۔"

شیطان ابن شیطان کی باتیں سن کر ملکہ بدی کی جان میں جان آ گئی۔ اب کچھ دیر پہلے شکست کا رونا رونے والوں کو بدی پورہ دوبارہ آباد ہوتا نظر آ رہا تھا۔

چند دِن بعد جب ملکہ بدی دربار میں آئی تو خوشامد نے آگے بڑھ کر خوشامد کرتے ہوئے کہا:

"آپ جیسا حسین اس دنیا میں کوئی دوسرا نہیں! آپ کے دوبارہ دربار سجانے پر نیکی نگر میں ضرور ہلچل مچ گئی ہوگی۔ آپ جیسی عقل مند ملکہ میں نے آج تک نہیں دیکھی۔"

ملکہ بدی نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو خوشامد ایک طرف بیٹھ گئی۔ اتنے میں غصہ، غصے سے بھرا دربار میں آیا۔ وہ اگرچہ زخمی تھا، مگر تھا غصے میں۔ ملکہ بدی کو جھک کر سلام کرنے کے بعد وہ غصیلے انداز میں بولا:

"مجھے نیکی نگر پر حملہ کرنے کی اجازت دی جائے، مجھ سے اپنا غصہ قابو نہیں ہو رہا۔ میں تحمل اور برداشت کو کچل کر رکھ دوں گا۔"

"کیا سارا غصہ یہیں نکال دو گے۔" نفرت بھی بول پڑی۔

جھوٹ بھی نیکی نگر جانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ سچ نے اس کی خوب مرمت کی تھی۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ بھی شکست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

ملکہ بدی نے ایک ایک کو دیکھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ سب سے پہلے کس کو اِنسانوں پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا جائے۔ اچانک ایک دھواں سا ہر طرف پھیل گیا۔ اس دھویں میں سے شیطان ابن شیطان نمودار ہوا۔ وہ غراتے ہوئے ملکہ بدی کے سامنے آ گیا۔

"اے ملکہ بدی! دیر کس بات کی ہے؟ اب تک تم نے اپنی رعایا میں سے کسی کو اِنسانوں پر حملہ کرنے کے لیے کیوں نہیں بھیجا!؟ ملکہ نیکی کی

اور اُس کی رعایا نے انسانوں پر قبضہ جمالیا ہے۔ ہر طرف سچ، محبت، ایمان داری، تحمل، حلال اور عاجزی کا رَاج ہے۔ گھروں، بازاروں اور تعلیمی اداروں میں سکون ہی سکون ہے۔ ملکہ بدی! ابھی اگر تم نے کچھ نہ کیا تو کوئی تمھارا نام لیوا نہ ہوگا۔ دیر مت کرو، حملہ کرو۔''

شیطان ابن شیطان کے لمبے اور خوف ناک دانت دیکھ کر ملک بدی کو بھی خوف آنے لگا۔ اس نے دربار میں موجود سب پر دوبارہ نگاہ ڈالی، پھر کچھ سوچ کر بولی:

''مجھے ملکہ نیکی پر بہت غصہ ہے، اس لیے.....''

''اس لیے میں، یعنی غصہ انسانوں پر حملہ کرنے جاؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے غصے نے ملکہ بدی کی طرف دیکھا۔

''ہاں، تمھی جاؤ گے اور سب کو سبق سکھاؤ گے۔ جاؤ، ابھی اور اِسی وقت جاؤ۔''

ملکہ بدی نے غصے کو حکم دیا۔

''میں ہر وقت اس کے ساتھ رہوں گا۔ مجھے شیطان اعظم نے اسی کام کے لیے بھیجا ہے، میں غصے کے ساتھ سائے کی طرح رہوں گا۔''

شیطان ابن شیطان نے قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا۔

.....☆.....

آج بہت دنوں بعد عادل اپنے دوستوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ کرونا وائرس کے باعث ایک جگہ اکٹھا ہونا محال ہو گیا تھا۔

وہ بھی کیا دن تھے! سب دوست اسکول میں ملتے تھے، مل کر پڑھتے اور کھیلتے تھے۔ آپس میں خوب باتیں بھی کرتے تھے۔ بچے اسکول جائیں اور شرارتیں نہ کریں، ایسا کیسے ممکن ہے، پھر کرونا وائرس کیا آیا! سب اپنے اپنے گھروں تک محدود ہو کر رہ گئے۔ آن لائن کلاسز کا آغاز ہوا۔ کبھی انٹرنیٹ غائب تو کبھی استاد کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ذرا سی بارش ہوئی اور اِنٹرنیٹ نے رخصت چاہی، ایسے پڑھنے میں بھلا مزہ ہی کیا ہے!

عادل نے کئی بار اپنے دوستوں کو گھر بلانے کی امی جان سے اجازت لینے کی کوشش کی، لیکن امی جان ہر دفعہ احتیاط کے پیشِ نظر منع کر دیتیں۔

پھر آہستہ آہستہ کورونا کی شدت میں کمی آنا شروع ہوئی۔ اسکول کھل گئے، مگر یہ کیا! گروپ ''اے'' ایک دن آتا تو گروپ ''بی'' دوسرے دن۔

عادل کے سارے دوست گروپ ''بی'' میں تھے اور وہ خود گروپ ''اے'' میں شامل تھا۔ اس کا دِل چاہتا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اسکول میں مل کر کھیلے، مگر ایسا ممکن نظر نہ آتا تھا۔ اسکول کے دروازے پر ٹمپریچر چیک ہونے کے بعد جماعت میں جانے کی اجازت ملتی۔ ایک مرتبہ سیٹ پر بیٹھ گئے تو بیٹھ گئے۔ نہ باہر جانے کی اجازت اور نہ تفریح کا وقفہ، جماعت میں ہی بیٹھ کر گھر سے لایا لنچ خود ہی کھایا جائے۔ کسی کے قریب بیٹھنے، ہاتھ ملانے، کھانے پینے میں کسی دوسرے کو شامل کرنے کی ہرگز اِجازت نہ تھی۔

عادل نے ۱۴، اگست کے موقع پر ایک تحریری مقابلے میں حب الوطنی کے موضوع پر مضمون لکھا تھا۔ ایک اشاعتی ادارے نے آن لائن اس مضمون نویسی کے مقابلے کا انعقاد کیا تھا۔

جب نتیجہ آیا تو عادل نے صوبے بھر میں اول انعام حاصل کیا تھا۔ اس بے مثال کام یابی پر اُس نے امی جان سے اپنے دوستوں کو گھر بلانے کی اجازت لے لی۔

سب دوست ایک سال کے بعد اِس طرح کسی جگہ اکٹھے ہوئے تھے۔ سب آن لائن کلاس میں ہونے والے لطیفوں کو بیان کر کے ہنس رہے تھے۔

''دانیال نے تو گویا قسم کھائی ہوئی تھی کہ سر کے کسی سوال کا جواب نہیں دینا۔ جب بھی سر کوئی سوال پوچھتے تو یہ فوراً کہتا: 'سر! آپ کی آواز صاف نہیں آ رہی، ذرا دوبارہ بولیے، جھوٹا کہیں کا!''

عادل نے دانیال کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تو میں جھوٹ بولتا رہا ہوں! جب سر کی آواز ہی صاف سنائی نہ دے تو میں کیا کروں!؟ انٹرنیٹ کے سگنل ہی اتنے کمزور ہوتے تھے کہ آواز ہی صحیح سنائی نہ دیتی تھی۔ میں جھوٹ نہیں بولتا تھا۔''

دانیال نے اپنی صفائی پیش کی۔

''بڑا آیا سچا! دیکھو، سچا ایسا ہوتا ہے!''

عبداللہ نے سب دوستوں کو مخاطب کر کے دانیال کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے، مت کرو میری بات پر اِعتبار! ہاں میں جھوٹا ہوں، جھوٹا ہوں، اب ٹھیک ہے۔''

دانیال نے عاجز آ کر کہا۔

''بھئی، یہ باتیں رہنے دو۔ اتنے دن کے بعد ملے ہیں، یہ لڑائی جھگڑا ٹھیک نہیں، ٹھنڈا ٹھنڈا شربت پیو اور اچھی اچھی باتیں کرو۔''

عادل نے شربت کا گلاس دانیال کی طرف بڑھایا۔

عادل کے ہاں ظفر کافی عرصے سے گھریلو ملازم کی حیثیت سے کام

کر رہا تھا۔ وہ شیشے کے جگ میں مزید شربت لایا تو قالین کے کونے میں اس کا پاؤں پھنس گیا۔ وہ لڑکھڑا کر عادل اور عبداللہ پر جا گرا۔ شربت ان دونوں پر گرا تو پردے کے پیچھے چھپے غصے نے عادل کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اب عادل پوری طرح غصے کے قابو میں تھا۔

''اتنا بدتمیز نوکر، اسے سزا دو، اسے تھپڑ مارو، تاکہ آئندہ یہ ایسی حرکت نہ کر سکے۔ آگے بڑھو، خبر لو اِس کی، اس نے تمھارے اور عبداللہ کے کپڑوں کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ آگے بڑھو، میں تمھارے ساتھ ہوں۔''

عادل، غصے کی ہر بات ماننے کے لیے تیار تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے عادل کا ریموٹ غصے کے ہاتھ میں ہو۔ غصے کے غصہ دلانے پر عادل نے دو تین زوردار تھپڑ ظفر کے منہ پر جڑ دیے۔ ظفر کو توقع نہیں تھی کہ عادل اپنے دوستوں کے سامنے اس طرح اس کے منہ پر تھپڑ مارے گا۔

وہ اپنے گال سہلاتے ہوئے بولا:

''وہ صاحب جی! میں نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا۔ قالین کے کونے میں میرا پاؤں پھنس گیا تھا۔''

''بس..... بس، منہ بند رکھو۔ آنکھیں کھول کر چلا کرو۔ آنکھیں اوپر ہوتی ہیں اور چل نیچے رہے ہوتے ہو۔''

عادل کے چہرے پر غصہ دیکھ کر غصہ خوش ہو گیا۔ اس نے زبردست وار کیا تھا۔

''شاباش! شاباش! نوکروں پر سختی نہ کی جائے تو یہ اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔ تم نے ٹھیک کیا ہے۔''

غصے نے عادل کو تھپکی دی۔

عادل کے دوست رخصت ہوئے تو امی جان نے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ سمجھ گیا کہ ظفر نے اس کی شکایت لگائی ہے۔ اس سے قبل کہ امی جان کچھ کہتیں، عادل غصیلے لہجے میں بولا:

''ظفر بہت بدتمیز ہے، آپ اور بابا کی نرمی نے اسے مزید بدتمیز بنا دیا ہے۔ گنوار، جاہل، پینڈو۔''

''ظفر نے جان بوجھ کر شربت تمھارے اور عبداللہ پر نہیں گرایا تھا۔ بے چارہ کب سے باورچی خانے میں آنسو بہا رہا ہے۔ جاؤ، اس سے معافی مانگو، جاؤ، دیر مت کرو۔''

امی جان نے عادل کو محبت بھرے انداز میں کہا۔

''میں، عادل مراد، ایک معمولی نوکر سے معافی مانگوں؟ ایک جاہل سے!''

عادل غصے سے چیخا۔

''عادل! زیادہ چیخو مت، تم نے غلطی کی ہے، غلطی کر کے اسے تسلیم کرنا بہادری ہے۔ غلطی پر ڈٹے رہنا درست نہیں، ظفر اچھا انسان ہے۔''

''ظفر اچھا انسان ہے تو میں کیا کروں؟ میں اس سے معافی نہیں مانگوں گا۔''

عادل امی جان کی کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ عادل کے انکار سے غصہ اور شیطان ابن شیطان بہت خوش تھے۔ غصے نے عادل کے کان میں سرگوشی کی:

''جھکنا مت، ڈٹے رہو، میں تمھارے ساتھ ہوں، یہ تمھارے ساتھ ہے۔''

''یہ..... یہ کون؟''

''کیا تم اسے نہیں دیکھ پا رہے؟''

غصے نے بائیں طرف اشارہ کیا تو عادل نے فوراً کہا:

''مجھے تو کوئی نظر نہیں آ رہا۔''

امی جان کچھ نہیں سمجھ پا رہی تھیں کہ عادل کس سے باتیں کر رہا ہے۔

''میری طرف دیکھو، میں شیطان ابن شیطان ہوں۔''

''شش..... شیطان ابن شیطان!''

عادل نے بمشکل دہرایا۔

''ہاں میں شیطان ابن شیطان ہوں۔ میرا نام ہے شرشر، مجھ سے ڈرو نہیں، بل کہ جو میں کہتا ہوں وہ کرو، میں ہوں شرشر۔''

شیطان ابن شیطان نے عادل کو کہا تو وہ خوف سے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

(پھر کیا ہوا؟ یہ جاننے کے لیے پڑھیے اگلی قسط)۔

محرم الحرام اور صوم یوم عاشورہ

وردہ صدیقی۔نوشہرہ

ماہ محرم الحرام اور خصوصی طور پر یوم عاشورہ ابتدا سے ہی بہت ہی محترم اور مقدس چلا آ رہا ہے۔

اس روز حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی۔ اس روز اللہ رب العزت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کو گلزار بنایا اور خلیل اللہ کا اعزاز نصیب فرمایا۔ اس روز حضرت یوسف علیہ السلام کو قید سے رہائی نصیب ہوئی اور انھیں مصر کا بادشاہ بنایا گیا۔

اسی روز حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کو فرعون کے ظلم و ستم سے نجات ملی۔ اس دن حضرت ایوب علیہ السلام کو بیماری سے شفا ملی اور اِسی روز حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ سے نکالے گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی اس دن ہوئی اور اِسی دن انھیں یہودیوں کے شر سے نجات دے کر آسمان پر اُٹھا لیا گیا۔

اس دن قریش کعبہ پر نیا غلاف ڈالتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس روز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا۔ اس روز نواسہ رسول، جگر گوشہ فاطمہ، حسین بن علی رضی اللہ عنہم کو میدان کربلا میں شہید کیا گیا۔

(نزہۃ المجالس، معارف القرآن، معارف الحدیث)

محرم الحرام کی فضیلت متعدد اَحادیث مبارکہ میں وارد ہوئی ہے۔ حدیث نبوی میں ماہ محرم ''شھر اللہ'' فرما کر اِس ماہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر کے اس کی شان و عظمت بتایا گیا ہے۔

دوسرے یہ ہے کہ یہ ماہ ''اَشہرِ حُرُم (حرمت والے مہینوں)'' میں سے ہے۔

(بخاری و مسلم)

تیسرے یہ ہے کہ اسلامی سال کی ابتدا اِسی ماہ سے ہوتی ہے۔

فضائل یوم عاشورہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص نے سوال کیا:

ماہ رمضان المبارک کے بعد میں کس ماہ کے روزے رکھوں؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''رمضان کے بعد اگر تمھیں کسی مہینے کا روزہ رکھنا ہے تو محرم کا رکھو! کیوں کہ وہ اللہ (کی خاص رحمت) کا خاص مہینا ہے۔ اس میں ایک ایسا دن ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی توبہ قبول فرمائی اور آئندہ بھی ایک قوم کی توبہ قبول فرمائیں گے۔

(الجامع للترمذی)

ام المومنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ چار اَعمال ایسے ہیں جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی نہیں چھوڑا۔ یوم عاشورہ کا روزہ، عشرہ ذی الحجہ کے (نو) روزے، ہر ماہ کے تین روزے اور فجر سے پہلے کی دو رکعت (سنت)۔

(سنن نسائی، مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عاشورہ کا روزہ رکھا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یہ وہ دن ہے جس کی تعظیم یہودی اور عیسائی بھی کرتے ہیں تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ہم آئندہ سال اس دنیا میں رہے تو نو (9) محرم کا روزہ بھی رکھیں گے۔

(ابوداؤد، مسند احمد)

حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا، وہ فرما رہے تھے: ''نویں اور دسویں کا روزہ رکھو اور یہود سے مخالفت کرو۔

(مسند احمد)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار کی مشابہت سے منع فرمایا اور مسلمانوں کو الگ شان اور پہچان عطا کرتے ہوئے ایک روزہ مزید ساتھ ملانے کا حکم دے کر یہود و نصاریٰ کی مشابہت سے بچنے کا حکم دیا۔

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''عاشورہ کے دن کا روزہ، مجھے اللہ کے کرم سے اُمید ہے کہ پچھلے سال کا کفارہ بنا دے گا۔''

(الصحیح المسلم، الجامع الترمذی)

بدعات اور رسومات:

ماہِ محرم الحرام اور خصوصاً یوم عاشورہ بہت ہی برکتوں اور رحمتوں والا دن ہے، لہٰذا اِس میں خوب خوب نیک اعمال کر کے ثواب کمایا جائے۔ اعمال بھی وہ ہوں جن کا شریعت میں ثبوت ہو، خود تراشیدہ اور من گھڑت روایات اور رسومات سے پرہیز کیا جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ثواب کے بجائے گناہ کما لیں۔

اللہ پاک ہمیں فضول رسومات اور بدعات سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی رضا کے ساتھ اس دن کو گزارنے اور خوب خوب برکتیں سمیٹنے والا بنائے۔ (آمین)

یہ پیارا سال نامہ ہے

انصار احمد معروفی۔ ہندوستان

سبھی کے دل کی دھڑکن ہے ، یہ پیارا سال نامہ ہے
ہر اک مضمون معیاری ، یہ ایسا سال نامہ ہے

پڑھا اعلان جب سے سال نامے کے نکلنے کا
گنا ہے اس کی خاطر دن ، نرالا سال نامہ ہے

اسے ہم پیار سے دیکھیں ، پڑھیں بے حد محبت سے
نہیں یہ ایسا ویسا ، سب سے اعلیٰ سال نامہ ہے

مری دادی بھی ہے حیران ، دادا بھی پریشاں ہیں
وہ کہتے ہیں: یہ کیا شے ہے ؟ یہ کیسا سال نامہ ہے؟

ہے نسخہ ایک اور امیدوار اس کے بہت سے ہیں
سبھی ہیں اس کے دعوے دار ، اپنا سال نامہ ہے

یہی آواز اٹھتی ہے ، یہی تکرار رہتی ہے
پڑھوں گا میں اسے پہلے ، یہ میرا سال نامہ ہے

بڑے کہتے ہیں بچوں سے: نہ فوٹو اس کے اب دیکھو
چلو مجھ کو بھی پڑھنے دو خدارا! سال نامہ ہے

بھلا ایجنٹ کا ہو ، میں نے اس سے پہلے کہہ ڈالا
کرو اک پرچہ مرا محفوظ ، اگلا سال نامہ ہے

مگر بچے بڑوں سے چھین لیتے ہیں یہ کہہ کہہ کے
کہ ہم بچے ہیں ، بچوں کا کھلونا سال نامہ ہے

کہانی جان دار اس کی ، لطیفے شان دار اس کے
ہیں نظمیں اس کی تفریحی ، یہ ایسا سال نامہ ہے

نرالی جس کی دنیا ہے ، نرالے جس کے باشندے
جو اک اَن مول ہیرا ہے ، وہ تحفہ سال نامہ ہے

کہاں تہذیب اور اخلاق کی تعلیم ملتی ہے؟
کوئی پوچھے تو کہہ دینا ، وہ پرچہ سال نامہ ہے

ہے دل میں ذوق وشوق اس کا ، عجب اس سے محبت ہے
مجھے لگتا ہے دل سے اس کا رشتہ سال نامہ ہے

ننھے شوقین کے لیے

14 اگست کے بعد

مریم شہزاد۔ کراچی

علی ایک بہت پیارا اور ذہین بچہ ہے۔ وہ ہر بات کو بہت غور سے سنتا اور سمجھتا ہے۔ ہے تو وہ ابھی بہت چھوٹا، مگر اُسے اکثر فکر رہتی ہے کہ لوگ گلیوں کو گندا کیوں کرتے ہیں، پارک میں کچرا کیوں پھینکتے ہیں۔

اب ۱۴، اگست آنے والی ہے۔ مس نے سب سے کہا کہ اچھی سی تقریر لکھوا کر لائیں۔ اچانک علی کو ایک خیال آیا، اس نے مس سے پوچھا:

''کیا میں خود تقریر لکھ سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں، یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔'' مس نے جواب دیا۔

گھر آ کر علی نے ایک تقریر لکھ کر امی کو دِکھائی۔ امی نے اسے بہت ساری شاباش دی۔ جہاں تھوڑی بہت غلطی تھی اسے ٹھیک کر دیا۔

دوسرے دن علی نے مس کو تقریر دکھائی، وہ بھی بہت خوش ہوئیں اور کہا:

''اسے زبانی یاد کر لو۔''

۱۴، اگست کو اِسکول میں فنکشن تھا۔ کچھ بچوں کو ملّی نغمے سنانے تھے، کچھ نے ٹیبلو پیش کرنا تھا اور کچھ کو تقریر کرنی تھی۔

کچھ دیر بعد تقریر کے لیے علی کا نام پکارا گیا۔

علی پورے اعتماد سے مائیک کے سامنے آیا اور تقریر شروع کی۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا:

''ہم جھنڈے اور جھنڈیوں وغیرہ سے اپنے گھروں کو، اسکول اور گاڑیوں وغیرہ کو سجاتے ہیں، مگر ۱۴، اگست کے بعد بھول جاتے ہیں کہ جھنڈے اور جھنڈیاں ہوا سے اُڑ کر پیروں میں آتے ہیں، کبھی بارش میں بھیگ جاتے ہیں اور خراب ہو جاتے ہیں، اس لیے ہمیں چاہیے کہ اپنے ملک کے جھنڈے کی عزت کریں اور اُس کی حفاظت کریں۔''

سب نے علی کی تقریر کو بہت پسند کیا اور خوب داد دی۔

آخر میں پرنسپل صاحب اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے کہا کہ علی ایک اہم بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہمیں جھنڈے کو صرف ہی نہیں، بل کہ اس کی عزت کرنی ہے، اور کمال کی بات یہ کہ یہ تقریر علی نے خود لکھی اب ہم علی کو بُلا کر پوچھتے ہیں اسے یہ خیال کیسے آیا۔

علی اسٹیج پر آیا اور بتایا:

''جب مس نے تقریر لکھوانے کا کہا تو مجھے یاد آیا کہ پہلے ۱۴، اگست پر بارش ہوئی تھی، جس سے تمام جھنڈے خراب ہو گئے میں نے سوچا کہ پہلے ہی سب کی توجہ اس طرف دلا دوں، تاکہ سال ہم احتیاط کریں۔''

علی کی بات سن کر سب لوگوں نے پختہ ارادہ کیا کہ اس اور آئندہ وہ ضرور اِس بات کا خیال رکھیں گے۔

اب انھیں اتار کر حفاظت سے

بہار آگئی!

مفتی محمد معاویہ اسماعیل۔ مخدوم پور

''آج، ابھی اور اِسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔ آج کے بعد تم مجھے اپنی منحوس شکل بھی مت دکھانا! کیا کیا ارمان تھے میرے، سب پر تم نے پَل بھر میں پانی پھیر دیا۔ ایک لمحے کے لیے بھی تم نے نہیں سوچا کہ اس فیصلے سے بوڑھے باپ کے دل پر کیا گزرے گی؟ وہ کیا سوچیں گے؟ انھیں کتنا دُکھ ہوگا؟ ان کی ساری محنت پَل بھر میں ضائع ہوجائے گی۔

اری او بیگم! خدا کے لیے تم ہی اس احمق کو سمجھاؤ۔ میں تو پاگل ہوجاؤں گا۔ کیوں یہ اپنی زندگی داؤ پر لگانے پر تُلا ہوا ہے۔ کیوں یہ اپنی زندگی برباد کرنا چاہتا ہے!''

بابا کے پاؤں دباتے ہوئے پتا نہیں اچانک مجھے کیا ہوا کہ بیس سال پہلے کے ان کے سلگتے ہوئے الفاظ، وہ انداز، وہ لب ولہجہ، سب مجھے یاد آ گیا اور ایک لمحے کے لیے میری آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔ بابا آرام سے آنکھیں موندے ہوش اور بے ہوشی کی کیفیت میں بستر پر دراز تھے۔ پتا نہیں وہ نیند اور مدہوشی کی کیفیت میں تھے یا پھر ویسے ہی آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹے ہوئے تھے۔

''چلو کبھی تو اِنھیں خیال آجائے گا۔ یا اللہ! انھیں دین کی محبت نصیب فرما!''

دل ہی دل میں کہتے ہوئے میں نے بڑی بے دردی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں اور پھر ہلکے ہلکے ہاتھوں سے ان کے پاؤں دابنے لگا۔

.....☆.....

میں شروع سے بتاتا ہوں، ورنہ شاید آپ کی کچھ سمجھ میں نہ آئے۔

آج سے تقریباً بیس سال قبل جب میں نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے فائنل ائیر میں کالج میں ٹاپ کیا تو میرے والدین کی خوشی دیدنی تھی اور اُن کی خوشی اس وقت تو دوبالا ہی ہوگئی جب پہلی تین پوزیشنز لینے والوں کو اَعلیٰ تعلیم کے لیے حکومت کی طرف سے بیرونِ ملک بھیجنے کا اعلان ہوا۔ میرے والد خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے، کیوں کہ میرے باقی دو بھائی بھی

ایم۔بی۔بی۔ایس تھے، مگر اُنھوں نے حالات کی وجہ سے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ اگرچہ پھر بعد میں انھوں نے ذاتی بل بوتے پر ایف۔سی۔پی۔ایس وغیرہ بھی کیا، مگر میرے والدین کی خواہش تھی کہ ہم بھائیوں میں سے کوئی ہارٹ اسپیشلسٹ بنے، وہ بھی باہر جا کر اور وہ بھی ایم۔بی۔بی۔ایس کے فوراً بعد۔ یہ امید اُنھیں مجھ سے پوری ہوتی نظر آ رہی تھی اور جب میرے لیے اسکالرشپ کا اعلان ہوا تو اُن کی خوشی دیدنی تھی، مگر جب میں نے والد صاحب سے کہا کہ باباجان! اب میں ڈاکٹری کی تعلیم کو آگے بڑھانے سے پہلے عالم بننا چاہتا ہوں، دین کا علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو فارغ ہونے کے بعد میں یہ سارے کورسز کر لوں گا اور.....''

''ہائیں! کیا! کیا کہا تُو نے!؟ ایک بار پھر کہنا!''

ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے بابا کو ہزار وولٹ کے کرنٹ نے چھو لیا ہے اور وہ مجھے اس طرح دیکھنے لگے جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ میرے باقی بھائی اور والدہ بھی حیران تھیں کہ اسے کیا ہو گیا ہے، مگر میرے والد صاحب کی حالت تو دیدنی تھی۔ ان سے برداشت نہ ہوا۔ وہ سب سے زیادہ غصے میں تھے، اور پھر وہ بولتے چلے گئے اور میں چپ چاپ سنتا رہا۔ میری والدہ پر بھی بہت غصہ ہوئے کہ اسے سمجھاؤ، مگر میں اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

''باباجان! میں نے اعلیٰ تعلیم سے انکار نہیں کیا۔ کروں گا، ضرور کروں گا، مگر میں پہلے عالم بنوں گا، پھر وہ سب کروں گا جو آپ کہیں۔''

''ارے او بے وقوف! تُو اپنا مستقبل خراب کر رہا ہے۔ مولوی بن کر تجھے کیا ملے گا؟''

''خدا..... خدا ملے گا باباجان! مولوی بن کر۔ دین پڑھ کر مجھے اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب ہوگی۔ مجھے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا طریقہ معلوم ہوگا۔ مجھے اس دنیا میں آنے کا مقصد معلوم ہوگا۔ اس کائنات کے بنائے جانے کا مقصد معلوم ہوگا۔ اگر یہ سب کچھ مجھے معلوم ہو جائے اور اِس کے مطابق میں عمل کرنا شروع کر دوں اور میرا اللہ مجھ سے راضی ہو جائے تو اِس کے علاوہ مجھے اور کیا چاہیے؟

دیکھیں باباجان! میں نے ایم۔بی۔بی۔ایس کیا۔ مجھے یہ تو بتایا گیا کہ انسانی جسم کی ساخت کیسی ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ کون سی علامات کون سی بیماری کا سبب بنتی ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ کس بیماری کے علاج میں کون سا فارمولا استعمال کروانے سے افاقہ ہوگا۔ انسانی جسم کی پہچان کروائی گئی۔ ایک ایک چیز بہت گہرائی سے سمجھائی گئی، مگر افسوس کہ کبھی کسی بھی پروفیسر کے منہ سے بھولے سے بھی یہ تک نہیں نکلا کہ یہ سب کچھ بجا ہے، مگر یہ سب کچھ بنانے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

وہ خداوند قدوس خود کتنا عظیم ہوگا جس نے ایسے انسان اور اُس کے ایسے جسم کو بنایا، جس میں کسی بھی لحاظ سے کوئی کمی نہیں رکھی۔ انسانی جسم کے اندر، اس کے خون کے اندر ایسی صلاحیت رکھی کہ جیسے ہی زخم لگتا ہے فوراً وہ صلاحیت حرکت میں آ جاتی ہے، جس کی وجہ سے زخم جلد ہی مندمل ہو جاتا ہے۔

جب ڈاکٹر تھک ہار کر کسی مریض سے اپنے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ اب اس کا بچنا ناممکن ہے تو پھر ہر ایک کو اُسی خداوند قدوس سے ہی آس ہوتی ہے اور پھر دعاؤں کے لیے ہاتھ اٹھتے ہیں، پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ کریم ذات کوئی کرشمہ دکھاتے ہوئے ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔ قریب المرگ کو بھی شفا دے دیتی ہے۔ وہ ذات کتنی عظیم ہے۔

ہم اس کی کتنی فرماں برداری کر رہے ہیں اور کتنی نافرمانی؟ یہ باتیں کسی نے نہیں بتائیں۔ باباجان! دنیا کو عالَم کبیر اور اِنسانی جسم کو عالَم صغیر کہا جاتا ہے، یعنی تمام دنیا کی پہچان انسانی جسم سے بھی ہو سکتی ہے۔ باباجان! مجھے یہ باتیں کسی نے نہیں بتائیں۔''

''اچھا اچھا، ٹھیک ہے، مجھے لیکچر دینے کی ضرورت نہیں، بس ایک بات کان کھول کر سُن لو۔ اگر تم میری بات نہیں ماننا چاہتے تو اَبھی اور اِسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ اور آئندہ مجھے اپنی شکل بھی مت دکھانا۔''

پھر اُس دن سے دو تین سال تک تو باباجان نے مجھ سے بات تک نہیں کی۔ میں گھر آتا تو صرف میری ماں تھی جو پہلے جیسی محبت سے مجھ سے بات کرتی اور بس۔ باقی بھائیوں سے کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی تو وہ بے رخی سے ملتے اور ''ارے ملا بھائی'' کہتے اور چلے جاتے۔

کچھ عرصے بعد بھائیوں کی ان کی من پسند شادیاں ہو گئیں، حالاں کہ میری والدہ اور بابا قریبی رشتے داروں میں عرصہ دراز سے ان کے رشتے طے کر چکے تھے، مگر میرے بھائیوں نے یہ کہہ کر بڑے آرام سے انکار کر دیا کہ زندگی ہماری ہے، شادی ہماری ہے تو فیصلہ بھی ہم خود ہی کریں گے۔ والدین کو اس کا بہت ہی دکھ ہوا، مگر بادل نخواستہ وہ ان شادیوں میں بھی شریک ہوئے۔

میں مدرسہ دور ہونے کی وجہ سے ویسے ہی مہینے بعد گھر آتا تھا۔ ایک مرتبہ گھر آیا تو پتا چلا کہ دونوں بھابیوں نے الگ الگ گھر کا مطالبہ کیا اور بھائیوں نے جھٹ پٹ والدین کو فیصلہ سنا دیا اور الگ ہو گئے۔ ایک مرتبہ پھر بابا جان کو ایک زبردست جھٹکا لگا، مگر وہ اسے بھی برداشت کر گئے۔

بابا مجھ سے چوں کہ ناراض تھے اس لیے مجھ سے تو بات نہ کرتے، بس اکثر اُن بھائیوں کے گھر چلے جاتے، پھر مرضی سے واپس آتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے الحمدللہ! دورۂ حدیث مکمل کر لیا۔ اپنی دستار بندی کے موقع پر میں نے والد صاحب سے درخواست کی کہ آپ بھی تشریف لائیں تو ایسے بھڑک اٹھے جیسے میں نے انھیں بہت ہی غلط بات کہہ دی ہو۔

''جاؤ، دفع ہو جاؤ۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ میں نہیں آؤں گا تمھاری دستار بندی میں۔ جاؤ، خود کرواؤ اپنی دستاریں۔ مجھے آئندہ نہ کہنا، اور ہاں، آئندہ یہ منحوس شکل بھی میرے سامنے نہ لانا۔''

بابا جان کی یہ باتیں سُن کر مجھے انتہائی افسوس ہوا۔ بابا جان کی یہ بات میرے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گئی۔ قریب تھا کہ میں کچھ بول پڑتا، مگر مجھے اللہ تعالیٰ کا حکم یاد آ گیا کہ والدین کو اُف تک نہ کہو، ان سے پیار سے بات کرو۔ بس یہی سوچ کر میں چپ ہو گیا۔ میری دستار بندی ہو گئی اور میں کچھ دن بعد گھر آ گیا۔

میں روزانہ بابا جان کے پاس جا کر اُن سے معافی مانگتا، مگر وہ ہر بار مجھے دھتکار دیتے۔ ایک دو مرتبہ والدہ نے سفارش بھی کی اور یہ بھی کہا کہ یہ اب اپنی تعلیم کو آگے بڑھائے گا، مگر میرے بابا جان بھی غصے میں ثانی نہیں رکھتے تھے، فرمایا: ''اب مجھے کوئی خواہش نہیں کہ یہ کچھ کرے یا نہ کرے۔''

میں روزانہ والدہ کی خدمت کرتا۔ بہن تو میری کوئی نہیں تھی۔ بھائی بھی اپنی بیویوں کے ساتھ الگ ہو گئے تھے۔ والدہ اکیلی کام نہیں کر سکتی تھیں، میں کام میں ان کا ہاتھ بٹاتا۔ آہستہ آہستہ میں نے روٹی سے بھی والدہ کو فارغ کر دیا کہ میں روٹی بھی بنا لیا کروں گا، بس آپ میرے لیے دعا کرتی رہا کریں اور میری والدہ دن رات مجھے دعائیں دیتی نہ تھکتیں اور ساتھ ہی تسلی بھی دیتیں کہ میں تمھارے بابا کو سمجھاؤں گی، امید ہے وہ تمھیں معاف کر دیں گے۔ یہ سُن کر میری آنکھیں بھیگ جاتیں کہ پتا نہیں کب وہ دن آئے گا جب بابا جان مجھے اپنے گلے لگائیں گے۔

شاید ایسے ہی دن گزرتے رہتے اگر وہ حادثہ نہ پیش آ جاتا جس نے میرے بابا جان کی زندگی بدل کر رکھ دی، جو ہمارے گھر میں بہار لے کر آیا۔

ایک دن امی نے مجھے بتایا کہ ''بیٹا! تیرے بڑے بھائی کا بیٹا ہوا ہے۔ صبح ہم جائیں گے۔ تم بھی میرے ساتھ چلنا۔''

''امی! دیکھیں، میرے بھائی مجھے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے، ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کو کوئی بات کہہ دیں۔ بہر حال، آپ کا حکم ہے، میں آپ کو لے جاؤں گا۔ بھائی سے مل کر وہاں ٹھہروں گا نہیں، فوراً واپس آ جاؤں گا، پھر جب آپ کا حکم ہو گا آپ کو لینے آ جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں سونے چلا گیا۔

رات کو اچانک میری آنکھ کھلی تو مجھے محسوس ہوا کہ والدہ کے کمرے سے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ میں پریشان ہو گیا۔ فوراً اُٹھا اور والدہ کے کمرے کی طرف دوڑا دوڑا گیا۔ قریب پہنچا تو رونے کی آواز والد صاحب کی تھی۔

''یہ کب آئے؟ یہ تو پچھلے کئی دنوں سے بھائی کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ میں بھی رات تقریباً ساڑھے گیارہ بجے والدہ کے پاس سے اٹھ کر آیا تھا، اس وقت تک تو نہیں آئے تھے۔''

یہی سوچتے ہوئے میں ابھی والدہ کے کمرے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ مجھے والد صاحب کی آنسوؤں میں رندھی ہوئی آواز سنائی دی:

''اری نیک بخت! آج بہت غضب ہوا! جن بیٹوں کو میں نے پیار دیا، جنھیں پڑھایا، آج اسی بیٹے کے بیٹے کی خوشی میں، میں گیا۔ گھر میں گہما گہمی تھی، رونق ہو رہی تھی۔ بیٹے کے سسرال والے آئے ہوئے تھے۔ میں اپنے بیٹے کے کمرے کی طرف گیا تو مجھ پر ایسا انکشاف ہوا جس نے ایک لمحے کے لیے گویا میرے دل کی حرکت ہی بند کر دی۔ میں نے سنا، اپنے ان کانوں سے سنا، میری بہو اپنے شوہر کو، میرے بیٹے کو کہہ رہی تھی کہ 'یہ بڈھا اتنے دنوں سے ہمارے گھر میں ٹکا ہوا ہے، اسے نکالو، ہماری تو جان کو ہی آ گیا ہے۔ میں نے الگ گھر اِسی لیے تو لیا تھا کہ اس بڑھیا اور بڈھے سے جان چھوٹ جائے گی، مگر مجھے کیا پتا تھا کہ یہ آفت یہاں بھی روزانہ پہنچی ہوئی ہو گی۔ بس انھیں کہہ دو کہ آئندہ ہمارے گھر آئیں تو صرف ملنے کے لیے آیا کریں، رہنے کی بالکل اجازت نہیں۔ ہماری ساری آزادی ہی اس بڈھے نے سلب کر کے رکھ دی ہے۔ اب اس کا کھانا بناؤ، اس کے کپڑے دھوؤ۔ مجھ سے نہیں کیے جاتے یہ کام۔'

بیگم! شاید یہ میں برداشت کر جاتا، مگر اپنے بیٹے کی باتیں سنیں تو میرے کان سلگنے لگے۔ وہ کہنے لگا:

'ہاں، میں بھی بہت تنگ ہوں۔ کیا کروں، کوئی بات کروں تو پھر برادری میں گلے شکوے کریں گے کہ میں نے انھیں اتنا پڑھایا، یہ میری خدمت بھی نہیں کر سکتے، ورنہ میں ان کو ایک منٹ بھی برداشت نہ کرتا۔ بس میں کل ہی انھیں کہہ دوں گا کہ بابا جان! آپ باری مقرر کرلیں۔ ہمارے ہی گھر میں مستقل نہ رہیں، کبھی دوسرے بھائی کو بھی خدمت کا موقع دیں۔'

'ہاں واقعی! تم یہ کہہ دینا۔ یہاں بھی اولڈ ہوم ہونے چاہییں۔' بہو نے کہا۔''

یہ کہہ کر ابا جان پھر ہچکیوں سے رونے لگے۔

''بتاؤ بیگم! میں نے کہاں کمی کی ان کی پرورش اور تربیت میں!؟''

''دیکھیں، آپ یہ نہ کہیں کہ تربیت میں! آپ نے ان کی تربیت کی ہی کہاں ہے؟ ہاں، آپ نے صرف ان کی پرورش کی ہے۔ انھیں پڑھایا ہے، مگر اُن کی تربیت نہیں کی۔ یہ تربیت تو صرف والدین کر سکتے ہیں یا پھر کوئی دین دار لوگ یا پھر کوئی دینی ادارہ۔ ہم نے کی نہیں اور دین داروں کی صحبت سے ہم نے خود ہی انھیں دور رکھا۔ اسکولوں اور کالجوں میں تو بچوں کو پڑھاتے ہوئے بھی یہی کہا جاتا ہے کہ محنت کرو گے تو اچھی نوکریاں ملیں گی، آپ بہت سارے پیسے کما سکیں گے۔ لالچ سکھایا جاتا ہے۔ وہ تو دینی ادارے ہیں جن میں اللہ، اللہ کے رسول اور والدین کی اطاعت اور اُن کے حقوق کی تعلیم دی جاتی ہے، خدمت خلق کی تعلیم دی جاتی ہے۔ معاشرے کا کام یاب فرد بننے کی، ہر ایک کے ساتھ محبت اور ہر ایک کی خدمت کی ترغیب و تعلیم دی جاتی ہے۔

لیکن آپ کو تو دینی مدارس سے خدا واسطے کا بیر ہے، جس کی وجہ سے آپ نے ایک بھی بیٹے کو دین کی طرف نہیں لگایا۔ ایک بیٹے نے اگر خود لگنا چاہا تو آپ اس کے دشمن بن گئے، اسے گھر سے بھی نکال دیا اور اَب تک اس کے ساتھ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے، حالاں کہ وہ روزانہ مجھ سے آپ کے بارے میں، آپ کی صحت کے بارے میں پوچھتا ہے کہ ماں! بابا کا کیا حال ہے؟ ان کی طبیعت کیسی ہے؟ ماں! وہ بھائیوں کے پاس اتنے دن ٹھہرنے کے لیے نہ جایا کریں تو بہتر ہے۔ پتا نہیں، وہاں وہ ان کا خیال رکھتے بھی ہیں یا نہیں؟''

''بب..... بس کرو بیگم! بس کرو۔ میں کل ہی اپنے بیٹے سے اپنے رویے کی معافی مانگوں گا۔ میں نے اسے کئی مرتبہ دیکھا ہے کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے، مگر میں ہی اسے دھتکار دیتا ہوں، اور ہاں، آج ایک بات میں تجھے اور بھی بتاتا ہوں، حالاں کہ میں تجھے کبھی یہ بات نہ بتاتا اگر یہ واقعہ پیش نہ آیا ہوتا۔

پچھلے مہینے جب میری طبیعت خراب تھی، بخار بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے میں گویا ہوش کھو بیٹھا تھا۔ وہ رات اب بھی مجھے یاد ہے، جب سب سو گئے تھے، حتی کہ تم بھی رات دو بجے کے قریب تھک کر سو گئی تھیں۔ میں خود بھی غنودگی میں تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے پاؤں دبا رہا ہے۔ میں نے فوراً آنکھیں کھولیں۔ روشنی مدھم تھی، اس کے باوجود میں پہچان گیا، وہ حنین تھا جو میرے پاؤں دبا رہا تھا اور کچھ پڑھ کر دَم بھی کر رہا تھا۔ پہلے تو میرا دل چاہا کہ اسے ابھی ہٹا دوں کہ اسے جرأت کیسے ہوئی مجھے چھونے کی، مگر میرا جسم اتنا ٹوٹا ہوا تھا، اتنی کمزوری تھی جسم میں کہ میری خود خواہش تھی کہ کوئی میرے پاؤں دبائے، میرا سر دبائے، مگر اَنا کی وجہ سے میں نے کسی کو کہا نہیں، حتی کہ بیگم! تمھیں بھی نہیں کہا اور خود کسی کو خیال بھی نہیں آیا۔ میں بھی چپکے سے لیٹا رہا۔ مجھے بہت سکون مل رہا تھا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں بند کرلیں۔ نیم تاریکی ہونے کی وجہ سے اسے بھی پتا نہ چل سکا کہ میں جاگ گیا ہوں۔ اس کے دبانے سے اتنا سکون ملا کہ تھوڑی ہی دیر بعد میں پُرسکون نیند کی وادی میں کھو گیا۔ اس کے بعد پتا نہیں وہ کتنی دیر تک میرے پاؤں دباتا رہا۔ صبح پھر وہی میری انا سامنے آ گئی اور میں نے تجھے بھی نہیں بتایا۔

مم..... مگر بیگم! اب مجھ سے نہیں رہا جا رہا۔ میں نے بہت نافرمانی کی ہے اپنے رب کی، اپنے پیارے اللہ کی۔ اپنے محبت کرنے والے خدا کی۔ ہاں بیگم! آج کے بعد یہی حنین ہی میرا بیٹا ہے۔ ابھی میں اپنے اللہ سے معافی مانگتا ہوں اور صبح اپنے بیٹے سے معافی مانگوں گا۔ میرا بیٹا مجھے معاف کر دے گا نا بیگم!؟ یا وہ نہیں کرے گا۔''

''نہیں نہیں، کیوں آپ ایسا کہہ رہے ہیں؟ آپ کو اُس سے معافی مانگنے کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ بس اسے تھوڑا سا پیار دیں، پھر دیکھیں وہ کس طرح آپ پر نثار ہوتا ہے۔''

''نہیں بیگم! تم مجھے مت روکنا! میں اپنے بیٹے سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں گا۔ میں نے اسے خود سے دور نہیں کیا، بل کہ گویا دین کو دور کیا۔''

اس سے آگے مجھ سے مزید کچھ نہ سنا جا سکا اور میں خاموشی سے آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے الٹے قدموں واپس اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ میری دعائیں رنگ لے آئیں تھیں۔ اب ہمارے گھر میں بھی بہاروں کا موسم آ چکا تھا، دین کی بہاروں کا!

☆اعتماد ایک شیشہ ہے، جو ایک بار ٹوٹ جائے تو دوبارہ نہیں جُڑتا۔

☆محنت سے بھی انسان تھک جاتا ہے اور کاہلی سے بھی، مگر محنت کا نتیجہ صحت اور دولت ہے اور کاہلی کا نتیجہ بیماری اور اِفلاس ہے۔

☆راحت، کثرت سے آمدنی میں نہیں ہے، قلتِ مصارف میں ہے۔

☆بے موقع بولنے سے چپ رہنا بہتر ہے۔

(ماریہ بنت محمد فیصل۔کراچی)

☆بے ادبی کرنے سے بدنصیبی آتی ہے۔

☆غصہ، عقل کو کھا جاتا ہے۔

☆امانت دار، مفلسی کے وقت آزمایا جاتا ہے۔

☆غیبت عمل کو کھا جاتی ہے۔

☆تکبر، علم کو کھا جاتا ہے۔

(ہانیہ بنت منور۔کراچی)

☆اگر اُونچی پرواز کرنا چاہتے ہو تو اپنی ہمت کو بلند رکھو، کیوں کہ ہمت ہی آپ کی اصل طاقت ہے۔

☆دنیا سے محبت نہ کرو، اس لیے کہ وہ مومنین کا گھر نہیں۔

☆شیطان کی ہم نشینی اختیار نہ کرو، اس لیے کہ وہ مومنین کا دوست نہیں۔

☆کسی کو اِیذا نہ پہنچاؤ، اس لیے کہ یہ مومنین کا شیوہ نہیں ہے۔

☆سب سے زیادہ وحشت کی چیز اور سب سے بڑی تنہائی، عجب اور خود پسندی ہے۔

☆ضرورت کی ایک حد ہے، مگر حرص کی کوئی حد نہیں۔

☆جس کا کوئی مقصد نہیں اس کی کوئی منزل نہیں۔

☆عقل مند وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ سنے۔

(سارہ فرخ۔سکھر)

☆مان لے:

۱۔ بھائی کا عذر، چاہے دل نہ مانے۔

۲۔ نصیحت کی بات چاہے کڑوی ہو۔

۳۔ دوست کا ہدیہ، چاہے حقیر ہو۔

۴۔ ماں باپ کا حکم، چاہے ناگوار ہو۔

☆جو شخص اپنے خلوص کی قسمیں کھائے اس پر کبھی اعتبار نہ کرو۔

☆دوسروں میں بُرائیاں تلاش کرنے کے بجائے اپنی برائیاں تلاش کرنے کی کوشش کرو۔

☆غصہ ایسا طوفان ہے جو دماغ کا چراغ بجھا دیتا ہے۔

☆اپنی ہار پر مت رو، کیوں کہ تمھاری ہار کسی کی جیت ہوتی ہے۔

☆اس محفل میں نہ جاؤ جس میں رسوائی کا اندیشہ ہو۔

☆محبت اور عداوت کبھی پوشیدہ نہیں رہتیں۔

(باقر علی۔لودھراں)

بکھرے موتی

قارئین

انوکھا خیال

حافظ محمد شمائل بن کامران۔ کراچی

''بھیا! چودہ اگست آنے والی ہے۔''

میں نے یاسر بھیا کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔

''ہوں!'' وہ بڑبڑائے۔

''بھیا! آپ نے میری بات پر غور کیا؟''

میں زوردار لہجے میں بولا۔

''کک.....کیا کہا تم نے؟''

وہ بے خیالی کے عالم میں بولے۔

''میں کہہ رہا ہوں، چودہ اگست آنے والی ہے!''

اس بار میں پُرزور انداز میں بولا۔

''تو میں کیا کروں؟ کیا چودہ اگست کو آنے سے روک دوں۔''

وہ بھنا اٹھے۔

''ارے نہیں، آپ چودہ اگست کو آنے سے ویسے بھی نہیں روک سکتے۔ وہ تو آ کر رہے گی، چاہے آپ جتنا زور لگا لیں۔''

میں چڑانے والے لہجے میں بولا۔

''ارے تو آگے کہو نا! سوئی کیوں اٹک گئی ہے؟''

بھیا کو سچ مچ غصہ آ گیا۔

''میں کہہ رہا تھا کہ کیا اس مرتبہ چودہ اگست کی تیاری نہیں کرنی، پورے گھر کو جھنڈیوں سے نہیں سجانا؟ گزشتہ سال آپ نے کہا تھا کہ تین بڑے جھنڈے خریدیں گے اور سامنے والی دیوار پر لگائیں گے۔ کیا آپ سب بھول گئے!؟''

میں ایک ہی رو میں کہتا چلا گیا۔

''ہاں بھئی، میں نے کہا ضرور تھا کہ ہم یہ سب کریں گے، مگر اَب میرا اِرادہ بدل گیا ہے؟''

بھیا بھرپور اَنداز میں مسکرائے۔

''جی.....کیا فرمایا!؟ ارادہ بدل گیا ہے!''

میرے لہجے میں حیرت دَر آئی۔

''ہاں، ارادہ بدل گیا ہے۔ ہم اس مرتبہ چودہ اگست ذرا نئے انداز میں منائیں گے۔''

بھیا کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔

''نئے انداز میں! تو کیا ہم اس مرتبہ نئے انداز میں چودہ اگست نہیں منا رہے؟ پہلے ہم ایک بڑا جھنڈا لگاتے تھے اب تین.....''

میں کہتا چلا جا رہا تھا کہ بھیا نے بات کاٹ دی:

''نہیں، وہ نیا انداز ذرا انوکھے قسم کا ہے۔''

''انوکھے قسم

کا!'' میں بڑبڑایا۔

''ہاں، انوکھے قسم کا۔''

پھر بھیا مجھے بتانے لگے کہ ان کے ذہن میں کیا تجویز ہے۔ بھیا کی بات سن کر میری آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں، مجھے بھیا کا خیال بہت پسند آیا تھا۔

.....☆.....

تیرہ اگست کی رات تھی۔ ہمارے گھر کے پچھلے حصے میں موجود چھوٹا سا باغ جھلمل کرتی اور ٹمٹماتی روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ سبز ہلالی جھنڈیوں نے ہمارے باغ کا حصار کیا ہوا تھا۔ باغ کے دائیں جانب ایک اسٹیج سجا تھا، جس کے روبرو سفید چاندنی سبز گھاس پر ایک عجیب سی بہار پیش کر رہی تھی۔

آج ہم تمام گھر والوں نے گزشتہ عید کے جوڑے پہن رکھے تھے۔ عشا کی نماز کے متصل بعد تقریب کا آغاز ہونا تھا، مگر مہمانوں کی آمد ہی عشا کے وقت شروع ہوئی۔

مہمانوں میں سبھی قریبی جاننے والے شامل تھے، میرے دوست، بھیا کے دوست، ابو کے دوست، رشتے دار اور محلے والے۔ ساجدہ آپی اور امی جان کی سہیلیوں کے لیے ہم نے دوسری منزل پر ایک بڑا کمرا منتخب کر دیا تھا، جس کی کھڑکی باغ میں ہی کھلتی تھی، تاکہ وہ بھی پس پردہ پروگرام میں شریک ہو جائیں۔

آخر ٹھیک دس بجے پروگرام کا آغاز ہوا۔ یاسر بھیا اسٹیج پر چڑھ گئے۔ اُن کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر نشر ہونے لگی:

''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! میں تمام آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ مجلس میں شرکت کرنے والے تمام بزرگوں اور عزیز دوستوں کا بہت بہت شکریہ کہ انھوں نے ہماری محفل کو رونق بخشی۔ دراصل ایسی محفل کا خیال مجھے اس وقت آیا جب میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہم ہر سال جھنڈے لگا کر اور نغمے پڑھ کر چودہ اگست کی خوشیاں بکھیرتے ہیں۔ کیوں ناں اس مرتبہ کچھ نیا کیا جائے!

میں سوچنے لگا کہ بھلا نیا کیا ہو سکتا ہے تو یہ بات ذہن میں آئی کہ ہمارے اکثر ہم وطن اپنے وطن کی تاریخ سے نابلد ہیں اور اُنھیں ان قربانیوں کا علم نہیں جو پاکستان کی تعمیر میں دی گئیں، لہٰذا اِس موضوع پر ہم نے اس محفل کا انعقاد کیا ہے۔

مسلمانوں کی کوئی بھی محفل ہو، اس کا آغاز کلام اللہ سے کیا جاتا ہے، کیوں کہ اس کی برکات اور اُس کی عظمت اتنی ہے جس کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے، لہٰذا میں دعوت دوں گا اپنے رفیق کو کہ وہ آئیں اور نغمۂ توحید سے ہمارے قلوب کو منور کریں!''

پھر بھیا کے ایک دوست اٹھے اور اُنھوں نے نہایت مسحور کن لہجے میں قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔ اب بھیا نے میرے ایک دوست کو دعوت دی جس نے نعت رسول مقبول ﷺ پڑھی۔ اس کے بعد میرے چچازاد بھائی نے ملی نغمہ پڑھا اور پھر تقریروں کا آغاز ہوا۔

پہلی تقریر میرے ایک دوست کی تھی جس نے جنگِ آزادی کا نقشہ کھینچا، پھر ہمارے محلے کے ایک ساتھی نے تقریر کی جس کا لبِ لباب تھا:

''پاکستان جن قربانیوں سے حاصل ہوا ہے ویسی ہی قربانیاں اس کے امن و امان اور ترقی کے لیے درکار ہیں۔''

پھر ساتویں اور آخری تقریر کا نمبر آ گیا اور وہ نمبر میرا تھا! بھیا کی تقریر نہیں تھی، کیوں کہ انھوں نے تو ''اسٹیج سیکریٹری'' کا عہدہ سنبھالا ہوا تھا۔ میں نے سنا، بھیا کہہ رہے تھے:

''اب تقاریر کے سلسلے کی آخری کڑی آ پہنچی ہے۔ میں اپنے برادرِ صغیر، جو کہ اس میدان میں کافی ذوق رکھتے ہیں، سے درخواست کروں گا کہ وہ تشریف لائیں اور ''آج کا پاکستان'' کے موضوع پر اظہارِ خیال فرمائیں۔''

اب باری آ گئی تھی میری، لہٰذا میں جی کڑا کر کے تلے قدم اٹھاتا اسٹیج کی جانب بڑھا۔ آج تک میں نے متعدد جگہوں پر تقریریں کی تھیں، مگر گھر کے کسی پروگرام میں تقریر کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔

تقریر ختم کر کے میں اسٹیج سے نیچے آیا ہی تھا کہ اسی اثنا میں ایک آواز گونجی:

پاکستان کا مطلب کیا..... لا الہ الا اللہ!

اور پھر تو خوب نعرے بلند ہوئے، پھر ابو جان نے مجمع سے گفتگو فرمائی اور آخر میں ہماری مسجد کے امام صاحب نے اپنی قیمتی نصائح سے مالا مال کر کے دعا کروائی اور یوں اس تقریب کا اختتام ہوا۔

مہمانوں کی عشائیے سے ضیافت بھی کی گئی۔

اگلے روز صبح ناشتے کے وقت جب سب دسترخوان پر موجود تھے، میری آواز اُبھری:

''آپی! کل آپ نے دیکھا کہ کیسے میری تقریر پر سب لوگ ہمہ تن گوش تھے؟''

''ہاں، وہ تو ٹھیک ہے، مگر میں اس بات پر پریشان ہو رہی تھی کہ تم تقریر کرتے کرتے اتنے پُرجوش ہو گئے کہ کہیں مائیک کو ہی اٹھا کر نہ پٹخ دو!''

آپی کے اس چٹکلے پر ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا، جب کہ ہم منہ بسور کر رہ گئے۔

وطن کا بٹوارا

بیگم ناجیہ شعیب احمد۔ کراچی

ندی کنارے پیپل کا بڑا سارے گھنا پیڑ لاتعداد پرندوں کا مسکن تھا۔

پُو پھٹتے ہی پیڑ کے اطراف کی فضا پرندوں کی چہکاروں سے گونج اٹھتی۔ اس کی لچکتی شاخوں پر آزادی سے جھولتے خوش رنگ پرندے، پیڑ کی چھاؤں میں پھدک پھدک کر دانا چگتیں رنگ برنگی چڑیاں، ٹیں ٹیں کا راگ الاپتے توتے، چہکتی مینا اور فاختائیں، کوکتی کوئل، ہدہد کی ٹک ٹک اور ماحول کو معطر کرتی مٹی کی سوندھی سوندھی مسحور کن خوش بُو، پیپل کے پیڑ کو سرسبز و شاداب رکھتی۔ یہ درخت بھانت بھانت کی بولیوں والے پرندوں کا آبائی وطن بن گیا تھا۔ پیڑ کے مکین شاد آباد تھے۔ انھیں آزادی سے چہچہاتا ہوا دیکھ کر پیڑ بھی مستی سے جھومتا۔

اس گھنے پیپل کے پیڑ سے کچھ ہی فاصلے پر کیکر کا ایک ٹنڈ منڈ درخت زمین پر تن کر کھڑا تھا۔ وہ پیپل کے درخت کی شادابی اور خوش حالی دیکھ کر جلتا کڑھتا رہتا۔ اسے چڑیوں کی چہچہاہٹ سے سخت نفرت تھی۔ ان چڑیوں اور پرندوں کے آپس کے اتحاد اور مل جل کر رہنے نے اسے شدید حسد میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ دن رات ان خوش حال پرندوں کے خوب صورت آشیانے کی بربادی کے خواب دیکھتا رہتا۔

سبھی پرندے اس کی جل ککڑی فطرت سے بخوبی واقف تھے، جبھی اس کے آس پاس پھٹکنے سے باز رہتے۔ شومئی قسمت سے کیکر کی اجاڑ ٹہنیوں پر بھولے بھٹکے اگر کوئی شوخ و چنچل پرندہ گھڑی بھر کو آن بیٹھتا تو کیکر کا جل ککڑا درخت جھلا کر اُسے اٹھا کر دور پھینکنے کی کوشش کرتا، مگر ناکام رہتا۔

البتہ کوؤں اور چیلوں سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ کوؤں اور چیلوں کی ان پیپل کے پیڑ والوں میں سے کسی سے بھی نہیں بنی۔ وہ تو آپس میں بھی بس اپنے مفاد کے لیے ساتھ رہا کرتے تھے، کیوں کہ کوے صرف شور مچانا جانتے تھے اور چیلیں حملہ کرنا، لیکن اکیلے برگد کے پیڑ پر چڑھائی کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا، تبھی وقتی تقاضے کے تحت انھوں نے آپس میں بنا رکھی تھی۔

سارا دن کوے کاں کاں کرتے ہرے بھرے پیپل کے اردگرد منڈلاتے رہتے اور موقع ملتے ہی چڑیوں کے گھونسلوں میں جا گھستے۔ ننھے منے بچوں کو ٹھونگیں مارتے اور انڈے گرا کر چیلوں کے لیے راستہ ہموار کر دیتے، پھر چیلیں اپنی مخصوص آواز نکالتے ہوئے ان معصوموں پر حملہ کرتیں تو درخت کے پُرسکون ماحول میں بھونچال آجاتا۔ ساری چڑیاں گھونسلوں کو چھوڑ کر پُھر سے دائیں بائیں اُڑ جاتیں۔ یوں دشمنوں کو تباہی مچانے کا

کھلا موقع مل جاتا۔ چڑیاں بے چارگی اور اَفسوس سے پھڑ پھڑا کر رہ جاتیں۔ روز روز کے حملوں سے ننھی چڑیاں تنگ آ گئی تھیں۔ تمام پرندے سنجیدگی سے سر جوڑ کر اِس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی تدبیریں کرتے رہتے، لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی۔

ایک دن ہوا یہ کہ بہت زور کی آندھی آئی اور اپنے ساتھ سارے کمزور درختوں، پیڑوں اور پودوں کو اُکھاڑ لے گئی۔ سارے درخت اجڑ گئے۔ بس وہاں ایک اکیلا پیپل کا گھنا پیڑ تھا جو تناور ہونے اور مضبوط جڑوں کے باعث اپنی جگہ صحیح سلامت کھڑا رہا۔

آندھی تھمنے کے بعد سارے پرندے اپنے اپنے مقام پر واپس لوٹنے لگے، مگر وہاں سوائے ایک پیڑ کے کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔ پیپل کے مکین بھی اپنے گھر لوٹ آئے تھے۔ وہ اپنے سامنے اجاڑ اور برباد درختوں اور اُن کے مکینوں کو دیکھ کر اَفسردہ بیٹھے تھے۔ دوسری جانب اجاڑ پرندے، پیپل کے مکینوں کی جانب سے مدد اور ہمدردی کے اشارے کے منتظر تھے۔

پیپل کے نوجوان پرندوں کی ٹولی بے گھر پرندوں (چیل اور کوؤں) کی حمایتی تھی، جب کہ دانا اور بوڑھے پرندوں کی رائے تھی کہ ان شر پسند عناصر کو اپنے پُرامن اور پُرسکون ماحول سے بہرصورت دور رکھا جائے۔

جوان اور جوشیلے پرندے اپنی ہمدردانہ اور اَمن پسند طبیعت کے باعث بزرگ پرندوں کو دلیلیں پیش کر کے مصیبت زدہ اور بے گھر پرندوں کی مدد کے لیے راضی کر رہے تھے۔

جوان پرندوں کو بوڑھے دانا ہدہد نے بردباری سے سمجھاتے ہوئے کہا:

''مسئلہ یہ ہے میرے پیارے بچو! وہ سب نوکیلے پنجوں اور تیز چونچوں کے مالک ہیں، مردار کھاتے ہیں۔ یہ سارے فسادی اور شر پسند پرندوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، جب کہ ان کے مقابلے میں ہم صلح جو، اَمن پسند پرندوں کے قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہماری سادہ طبیعت ان کی عیار فطرت سے بالکل بھی میل نہیں کھاتی۔ ہم دانہ دنکا کھا کر شکر کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ ہم لوٹ کھسوٹ اور بدمعاشی کرتے ہوئے کسی پرندے کا گھونسلا نہیں اُجاڑتے۔''

''مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ یہ بے چارے آخر جائیں کہاں؟ ہمارا پیڑ اِتنا وسیع و عریض ہے۔ یہ سارے پرندے اس پیڑ کی چھاؤں میں آرام سے بیٹھ جائیں گے۔''

ہرے توتے نے بزرگ ہدہد کی بات سے اتفاق نہ کرتے ہوتے ہوئے کہا۔

لقا کبوتر نے ہرے توتے کو نرمی سے ٹوکتے ہوئے کہا:

''نہ نہ، میرے بچے! جذبات کو لگام دو۔ سمجھ داری اور دُور اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ ہمیں کسی صورت اپنے وطن کا بٹوارا نہیں کرنا چاہیے۔ ہم نے ایک مرتبہ انھیں اپنے گھر میں جگہ دے دی تو پھر.....''

''کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ڈر ڈر کر جینا چھوڑ دیں، مدد کرنا سیکھیں۔''

بگلا بدلحاظی سے بات کاٹتے ہوئے بولا۔

بزرگ پرندوں کی تمام تر دلیلوں کے نتیجے میں سب سے پہلے فاختہ بی نے حتمی فیصلہ کرتے ہوئے بے گھر پرندوں کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ بی فاختہ کی جانب سے مدد کا اشارہ پاتے ہی جوان پرندے اپنی جیت پر خوشی سے پھولے نہ سمائے اور اُونچی پروازیں کرتے ہوئے چہچہانے لگے۔

اجازت کا پروانہ جاری ہوتے ہی ندی کنارے کھڑے پیپل کے اردگرد ایک ہڑبونگ سی مچ گئی۔ ہواؤں میں تیرتے تمام بے گھر پرندے غول در غول پیپل کی چھاؤں تلے جمع ہونے لگے۔ آن کی آن وہ سب پیپل کی شاخوں پر براجمان ہوتے چلے گئے۔ یہ اتنی زیادہ تعداد میں تھے کہ گھنا پیڑ اُن کے لیے کم پڑ گیا۔

فسادی پرندوں نے آتے ہی اپنے پنجوں اور نوکیلی چونچوں سے ٹھونگیں مار مار کر بزرگ پرندوں کو اَدھ موا کر دیا۔ وہ فسادی پرندے تمسخر اڑاتے ہوئے سادہ لوح معصوم پرندوں پر دھاوا بول کر بدمعاشی سے کہہ رہے تھے:

''دیکھو، ہم نے تمھارے جوان اور خوب صورت پرندوں کو کیسے آسانی سے بے وقوف بنا کر تمھارا اِقتدار، تمھارا سکھ چین اور تمھارا گھر، سب تم سے چھین لیا۔ ہم زبردست ہیں۔''

وہ تکبر اور نخوت سے کہتے ہوئے پروازیں بھرتے ہوئے ان کے اطراف منڈلا رہے تھے۔

سارے معصوم اور اَمن پسند پرندے اپنے گھونسلوں میں سکڑتے سمٹتے چلے گئے۔

بقیہ صفحہ نمبر 53 پر

خونی جمناسٹر ①

محمد واصف شیزار۔ کراچی

ہوٹل کراؤن میں اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ ہوٹل میں تقریباً اندھیرا تھا اور کافی ملازمین کی بھی چھٹی ہو چکی تھی۔ اچانک سیڑھیوں سے ایک شخص ہاتھ میں ایک عجیب سی چیز اٹھائے ہوٹل کی تیسری منزل پر آیا۔ جہاں ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔

وہ آدمی تیز تیز قدم اُٹھاتا کمرا نمبر 302 کے دروازے پر کر رُک گیا۔ اُس آدمی نے نقاب کے ذریعے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ ماسٹر چابی کے ذریعے اس نے تیسری منزل کا کمرا نمبر 302 کا دروازہ کھولا۔

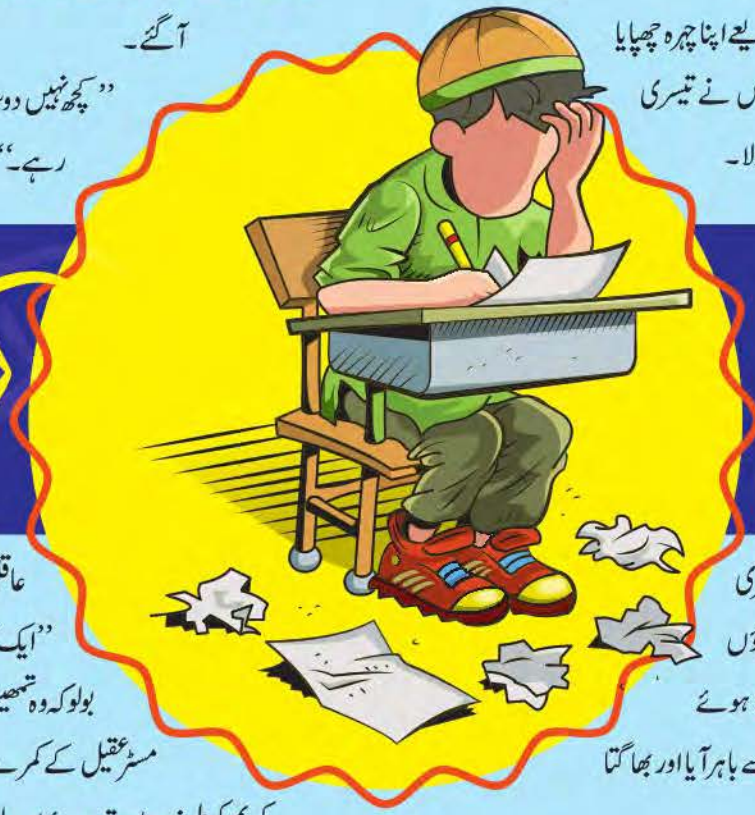

کمرے میں موجود شخص گہری نیند سو رہا تھا۔ نقاب پوش دبے پاؤں اندر آیا اور وہ عجیب سی چیز سوئے ہوئے آدمی کے سرہانے رکھ کر کمرے سے باہر آیا اور بھاگتا ہوا نیچے چلا گیا۔

.....☆.....

''ٹھک..... ٹھک..... ٹھک..... صاحب! دروازہ کھولیے، کمرے کی صفائی کرنی ہے۔'' صفائی کرنے والے نے تین، چار مرتبہ دستک دی، مگر دروازہ نہیں کھولا گیا۔

''کیا ہوا کریم!؟ اتنا شور کیوں مچا رہے ہو؟'' تیسری منزل سے گزرتے ہوئے ہوٹل کراؤن کے مالک مسٹر اعظم نے پوچھا۔

''کچھ نہیں سر! میں تو دروازے پر دستک دے رہا ہوں اور یہ صاحب دروازہ ہی نہیں کھول رہے۔'' کریم بولا۔

''اوہ اچھا! ارے یہ تو کمرا نمبر 305 ہے، یہاں تو مسٹر فاخر خان رُکے ہوئے ہیں۔ وہ کیوں نہیں کھول رہے دروازہ؟ تم ہٹو، میں دیکھتا ہوں۔'' مسٹر اعظم نے کریم کو دروزے سے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر فاخر! مسٹر فاخر! دروازہ کھولیے۔'' مسٹر اعظم نے آواز لگائی، مگر ناکامی ہوئی، یہاں تک کہ مسٹر اعظم نے دروازہ دھڑ دھڑا ڈالا، مگر دروازہ نہیں کھولا گیا۔

''ارے کیا ہوا اعظم!؟ صبح ہی صبح اتنا شور کیوں مچایا ہوا ہے؟'' کمرا نمبر 302 سے نکلنے والے مسٹر عقیل بولے۔ اتنے میں آس پاس کے کمروں کے لوگ بھی آ گئے۔

''کچھ نہیں دوست! مسٹر فاخر دروازہ ہی نہیں کھول رہے۔'' مسٹر اعظم اپنے بچپن کے دوست مسٹر عاقل سے بولے۔

''ایک کام کرو کریم! نیچے کاؤنٹر کلرک سے بولو کہ وہ تمھیں ماسٹر چابی دے دے، جس سے ہم مسٹر عقیل کے کمرے کا دروازہ کھول سکیں۔'' مسٹر اعظم، کریم کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔

ٹھیک ہے سر!'' کریم بولا اور بھاگتا ہوا کاؤنٹر کی جانب دوڑ پڑا۔

''ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ رات کو کہیں چلے گئے ہوں۔'' ایک مسافر بولا۔

''نہیں جناب! ہوٹل کے دروازے روزانہ صبح دس بجے کھلتے ہیں اور اَبھی ساڑھے نو بج ہو رہے ہیں۔'' مسٹر اعظم بولے۔

''اور کل رات کو ساڑھے گیارہ بجے تک تو میں اُن سے باتیں کر رہا تھا۔'' مسٹر عقیل بولے۔ اتنے میں کریم بھاگتا ہوا اوپر آیا اور ہانپتے ہوئے بولا:

''سر! غضب ہو گیا!''

''ارے، ارے! کیا ہوا؟ تمھارے چہرے پر اتنی پریشانی کیوں دکھائی

دے رہی ہے؟'' مسٹر اعظم بولے۔

''سر! کاؤنٹر سے ماسٹر چابی غائب ہے۔'' کریم بولا۔

''کیا!'' مسٹر اعظم سمیت دوسرے لوگ بہت زور سے چلّائے۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' مسٹر اعظم بولے۔

''پتا نہیں سر! میں بھاگتا ہوا نیچے گیا، کاؤنٹر کلرک سے کہا کہ مجھے چابی دو، اس نے ڈھونڈی، لیکن چابی بالکل ایسے غائب ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔'' کریم بولا۔

''اچھا خیر، ابھی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ کریم! ایسا کرو کہ سردانش سے بولو کہ وہ دوسری ماسٹر چابی کے پاس یہاں آئیں۔ میں احتیاط کے طور پر دوسری ماسٹر چابی اپنے پاس بھی رکھتا ہوں۔'' مسٹر اعظم بولے۔

''او کے سر! میں ابھی سردانش کے ساتھ آتا ہوں۔'' کریم یہ کہتے ہوئے ہوٹل کراؤن کے مینیجر ''سردانش'' کو بلانے چلا گیا۔

.....☆.....

فون کی گھنٹی بجی، سب انسپکٹر کاشف نے ریسور اُٹھایا:

''السلام علیکم! سب انسپکٹر کاشف بات کر رہا ہوں۔''

''کاشف! یہ میں بات کر رہا ہوں، اعظم۔''

''کون اعظم؟'' سب انسپکٹر کاشف بولے۔

''ہوٹل کراؤن کا مالک اعظم بول رہا ہوں۔''

''اچھا اعظم! کیسے ہو؟ اتنے دنوں بعد فون کیا تم نے؟ خیریت!'' سب انسپکٹر کاشف اپنے دوست مسٹر اعظم سے بولے۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے! جلدی سے ہوٹل پہنچو، ایک سنگین مسئلہ درپیش ہے۔'' مسٹر اعظم بولے۔

''اچھا، میں بس تھوڑی دیر میں سرغوری کے ساتھ پہنچتا ہوں۔'' سب انسپکٹر کاشف بولے اور ریسیور رکھ دیا۔

.....(جاری ہے).....

اچھی سوچ

ملائکہ سلیمان۔ کراچی

اسد اور ریان، دونوں بہت گہرے دوست تھے۔ دونوں کی دوستی کا آغاز کالج سے شروع ہوا۔ ان کا گھر بھی ایک دوسرے کے ساتھ تھا۔ دونوں میڈیکل کالج کے طالب علم تھے۔ دونوں کی دوستی پورے علاقے میں مثالی تھی۔ وہ ایک ساتھ کالج جاتے، ایک ساتھ پڑھتے لکھتے اور گھومتے۔ ریان پڑھائی میں بھی اچھا تھا اور اَخلاق میں بھی، جب کہ اسد دِل کا اچھا تھا اور پڑھائی میں بس ٹھیک ہی تھا۔

ایک روز ریان نے اسد سے کہا:

''یار! مجھے ڈاکٹر بنے کا بہت شوق ہے اور لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں، لیکن مجھے اپنے ڈاکٹر بننے سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ ڈاکٹر بنیں گے اور.....''

اسد ریان کی بات کاٹتے ہوئے بولا:

''ریان! تمھیں کس نے کہہ دیا کہ میں ڈاکٹر بنوں گا۔ تم نے میڈیکل میں داخلہ لیا تھا تو میں نے بھی لے لیا۔ میں بس کالج تک ہی پڑھوں گا اور تم سوچتے ہی رہو کہ تم ڈاکٹر بنو گے، کیوں کہ ہمارے والدین کے پاس اتنے پیسے نہیں ہے کہ وہ ہمیں ڈاکٹر بنائیں۔ بھائی! ویسے بھی میرا ڈاکٹر بننے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' اسد کی بات سن کر ریان اسے سمجھاتے ہوئے بولا:

''میرے دوست! انسان اچھی سوچ کے ساتھ ہی آگے بڑھتا ہے اور اگر وہ پختہ ارادہ کرلے تو وہ زندگی میں جو چاہے حاصل کرسکتا ہے، ساتھ ساتھ اپنے رب پر کامل یقین اور بھروسا ہو تو اللہ تعالیٰ اُسے ضرور پورا کرتے ہیں اور مجھے اپنے اللہ پر پورا یقین ہے۔'' یہ سن کر اَسد کہنے لگا:

''تم اچھی سوچ رکھو اور صرف سوچتے ہی رہو۔'' اسد طنزیہ لہجے میں کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ کچھ دن بعد پرچے شروع ہوگئے اور دونوں ہی امتحان میں مصروف رہے۔ اب نتیجہ آنا تھا۔ ریان کی محنت رنگ لائی اور ریان پورے کالج میں اول نمبر آیا، جب کہ اسد صرف پاس ہوا۔ حکومت کی طرف سے ریان کو آگے پڑھنے کا موقع ملا اور طب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اسے بیرونِ ملک بھیج دیا گیا۔

چھے سال بعد ریان ڈاکٹر بن کر واپس آیا۔ اسد بہت خوش ہوا اور اُسے گلے لگاتے ہوئے بولا:

'مجھے بہت خوشی ہے کہ تم ڈاکٹر بن گئے۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا میرے دوست! اگر اِنسان اچھی سوچ اور پختہ ارادہ کرلے تو وہ زندگی میں کبھی ہار نہیں سکتا اور جیت اُس کا مقدر بن جاتی ہے۔ بس اپنے رب پر بھروسا رکھنا چاہیے، کام یابی اس کے قدم چومے گی۔ بے شک اللہ تعالیٰ محنت

کرنے والوں کو کام یابی ضرور عطا کرتا ہے۔"

پیارے بچو! آپ نے دیکھا کہ انسان اگر محنت کرے اور اچھی سوچ رکھے تو وہ ضرور کام یاب ہوتا ہے، اس لیے ہمیں کبھی ہار نہیں ماننی چاہیے اور اپنے اللہ پر بھروسا اور یقین رکھنا چاہیے۔

آزاد نظم:

خدا کو یاد کر لینا

یسریٰ بنت محمد فرقان۔ البدر اسکول، کراچی

پھنسے ہو مشکلوں میں گر
سدا فریاد کر لینا
خدا کو یاد کر لینا
وہ مشکل دور کر دے گا
تمھیں رستہ دکھا دے گا
تمھارے غم مٹا دے گا
اگر آنسو بھی آجائیں
ان آنکھوں میں تمھاری تو
سدا فریاد کر لینا
خدا کو یاد کر لینا
خدا سے تم دعا کرنا
خدا تم کو سنبھالے گا
وہ گرنے سے بچالے گا
سدا فریاد کر لینا
خدا کو یاد کر لینا
تم اپنے دل کو اللہ کی محبت سے سجا لینا
کسی مومن سے ہرگز بھی نہ رکھنا بغض اور کینہ
گناہوں سے جو ہو بچنا
سدا فریاد کر لینا
خدا کو یاد کر لینا

بقیہ: وطن کا بٹوارا

ان فسادی پرندوں کا مقصود اپنے میزبانوں کی ہمدردیاں حاصل کر کے ان کے گھنے سرسبز و شاداب پیڑ پر قبضہ جمانا تھا، سو وہ حاصل ہو رہا۔

دور پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھے جوان باز نے جو گھنے پیڑ پر اَن گنت پرندوں کا جمگھٹا دیکھا تو وہ برق رفتاری سے پرواز کرتا ہوا نیچے آیا اور باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد چند لمحوں میں ہی معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔

گو کہ وہ بھی چیر پھاڑ کر کے شکار کر کے کھانے کا عادی ہے، لیکن اس کی فطرت میں شرارت اور فتنہ نہیں ہے۔ یہ غیرت مند اور خوددار پرندوں کی نسل سے تعلق رکھنے والا بلند پرواز پرندہ ہے۔

ہوا میں معلق جوان باز نے آہستہ آہستہ اوپر کی جانب پرواز بھرتے ہوئے ایک زوردار آواز بلند کی۔ یہ باز کی مخصوص آواز تھی۔

اس آواز کو سنتے ہی اردگرد موجود تمام شکرے، باز، عقاب اور شاہین اس آواز کی سمت اس طرح دوڑے چلے آئے کہ آسمان کی نیلاہٹ پرندوں کے جھرمٹ میں چھپ کر رہ گئی۔ جوان باز کے ایک اشارے پر فعال اور مستعد جوان شاہینوں، شکروں اور عقابوں کی فوج تیزی سے آگے بڑھی۔ انھوں نے چُن چُن کر تمام فسادیوں کو گھنے پیڑ سے نکال باہر کر دیا۔

ندی کنارے پیپل کے پیڑ کے چاروں اطراف شر پسند پرندوں کی لاشیں پڑی دِکھائی دے رہی تھیں۔

زخمی پرندوں کی مرہم پٹی کرتے ہوئے جوان پرندوں کی آہیں نکل رہی تھیں۔ وہ اپنے دور اندیش بزرگوں کی بات نہ مان کر شدید نقصان اُٹھانے کے بعد خود کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے۔

وہ سب سخت شرمندہ تھے۔ ان کی بے وقوفی اور ناعاقبت اندیشی کے باعث پیپل کے کئی معصوم مکین بے گناہ موت مارے گئے تھے۔

انھیں اپنے وطن، اپنے پیپل کے پیڑ کی قدر و قیمت کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ اب وہ تا قیامت کسی بھی قیمت پر اپنے وطن کا بٹوارا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

قیمت آزادی

عالیہ ذوالقرنین۔ لاہور

احسن اپنی چھوٹی سی سائیکل صاف کرتے ہوئے لہک لہک کر کچھ گنگنا رہا تھا۔ دادا جان نے عینک کے اوپر سے اس کی ''مشغولیت'' کا جائزہ لیا۔ جہاں اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ ان کے ماتھے کی شکنوں اضافہ کر رہے تھے وہیں ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھی جھلملانے لگی تھی۔

''احسن بیٹا! یہاں آؤ۔''

دادا جان نے شفقت سے آواز دیتے ہوئے اس کی مصروفیت کی جھیل میں گویا کنکر پھینکا۔

''جی دادا جان!''

احسن اگلے ہی لمحے سائیکل چھوڑ کر اُن کے سامنے کھڑا تھا۔

''احسن بیٹا! ابھی آپ کچھ گنگنا رہے تھے نا! ذرا مجھے بھی تو سنایئے۔''

دادا جان بڑے نرم لہجے میں گویا ہوئے۔

''وہ..... وہ..... دادا جان! کچھ بھی نہیں..... بس ایسے ہی.....'' شرمندگی اور جھجک سے احسن کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔

''احسن بیٹا! میرے پاس آؤ، یہاں بیٹھو۔''

دادا جان نے محبت بھرے انداز میں احسن کو اپنے پاس بٹھایا اور آہستہ آہستہ اس کا سر سہلانے لگے۔

''بیٹا! تم مجھ سے سے اکثر پوچھتے ہو نا کہ میں چودہ اگست کے دن کیوں روتا ہوں؟ تمھارا سوال میں اکثر تمھیں چھوٹا سمجھ کر ٹال جایا کرتا تھا، لیکن میں آج تمھیں بتاتا ہوں کہ ان آنکھوں میں کون سا دُکھ چودہ اگست کو ہچکولے لیتا ہے۔''

دادا جان کی نظریں دور کہیں خلا میں کچھ اَن دیکھا دیکھ رہی تھیں اور دُکھ کی دبیز چادر نے ان کے نورانی چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔

''بیٹا! ہم تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔'' دادا جان نے کہنا شروع کیا۔ ''سب ہنسی خوشی ہندوستان کے ایک قصبے میں رہتے تھے۔ ہمارے اردگرد جہاں مسلمان آباد تھے وہیں کئی ہندو گھرانے بھی رہائش پذیر تھے۔ جناح صاحب نے جب الگ وطن کا مطالبہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو اُن کا ساتھ دینے کا کہا تو ہمارے والد صاحب نے بھی ان کی آواز پر لبیک کہا اور ہمارے وجہ پوچھنے پر بولے: 'بیٹا! ہندو ایک بدطینت دشمن ہے، اس کے خمیر میں وفا نہیں۔ یہ وہ سانپ ہے جو دُودھ پی کر بھی پلانے والے کو ڈسے گا۔' انھوں نے کتنا صحیح کہا تھا!''

دادا جان نے عینک اتار کر اپنے آنسو صاف کیے اور سلسلہ کلام جاری رکھا:

''وہ اگست کا ہی ایک دن تھا۔ قیام پاکستان کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ وہی ہندو جو ہماری محبت کا دم بھرتے تھے، اب آگ کی مشعلیں پکڑے ہم مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا رہے تھے۔ ہم بہن بھائی اور اماں ابا بڑی مشکل سے جان بچا کر وہاں سے نکلے اور پاکستان ہجرت کرنے والے قافلے میں شامل ہو گئے۔ اب صرف ایک ہی دھن سر پر سوار تھی کہ کسی طرح اپنی مٹی، اپنے ملک ''پاکستان'' تک پہنچ جائیں۔ پاکستان کچھ ہی دور تھا۔ ہر بڑھتا ہوا قدم جہاں ہماری تھکن میں اضافہ کر رہا تھا وہیں ہمارا جوش بھی بڑھا رہا تھا۔

'ابا! بس اب اور نہیں چلا جا رہا۔'

اچانک میری چھوٹی بہن پیاس کی شدت سے روتے ہوئے زمین پر تقریباً گر ہی گئی۔

'ابا! مجھے بھی پانی پینا ہے۔'

'ابا مجھے بھی۔'' ایک ایک کر کے سب چھوٹے بہن بھائی پیاس کی شدت سے چلانے لگے۔ ابا نے دائیں بائیں نظر ڈالی، مگر پانی کہاں تھا!

'وہ دیکھو، غالباً وہ کوئی کنواں ہے۔ چلو، وہاں تک چلو، جلدی کرو۔' قافلے میں سے ہی کوئی خوشی سے چلایا۔ ہم سب گرتے پڑتے اس کنویں تک پہنچے۔ لوگوں نے کپڑوں کی دھجیاں پھاڑ کر رسیاں بنائیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی سے بھرے کئی برتن باہر نکلنے لگے۔ ابا نے بھی اپنے کندھے سے کپڑے کا تھیلا اتارا۔ اس میں سے ایک ڈبا اور رسی نکالی اور کنویں میں ڈالی۔ ڈبے میں پانی بھر کر کھینچا اور پانی کے باہر آتے ہی میرے سارے چھوٹے بہن بھائی پانی پر ٹوٹ پڑے اور پھر.....''

دادا جان آنسوؤں سے رو رہے تھے۔

''پھر کیا ہوا دادا جان!؟'' احسن نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''پھر..... پھر اُن کی پیاس ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔ میرے سب بہن بھائی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ قافلے والوں میں سے بھی پانی پینے والوں کی لاشوں کے انبار لگتے چلے گئے۔ کنویں میں ہندوؤں نے زہر ملا دیا تھا۔''

بے آواز آنسو دادا جان کی داڑھی بھگو چکے تھے۔

''میں اور میرے اماں ابا اور دوسرے قافلے والے بہت دقتوں اور تکلیفوں کے بعد بالآخر یہاں، پاکستان پہنچنے میں کام یاب ہو گئے۔ کیا ہی منظر تھا جب سب کچھ لُٹا کر آنے والے لوگ آتے ہی اس پاک سرزمین پر سجدہ کرتے اور اِس کی مٹی کو والہانہ چومتے تھے۔ اپنے پیاروں کو اپنے سامنے مرتا دیکھنے کا دُکھ تھا تو اپنے لیے اس خطۂ زمین کو پا لینے کی خوشی بھی تھی۔ ہم اپنے پیارے آزاد ملک ''پاکستان'' میں تھے۔ لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر لوگوں کو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل چکی تھی۔''

''دادا جان! اب تو آپ کو اِس ملک کو آزاد دیکھ کر چودہ اگست کو بہت خوش ہونا چاہیے!'' احسن نے جوش سے کہا۔

''ہاں، ہم خوش ہوتے تھے، مگر اَب یہ خوشی ماند پڑتی جا رہی ہے، جب میں بسنت کے لیے لوگوں کو بے تاب دیکھتا ہوں، جب میں شادیوں میں ہندوؤں کی طرح کے رسوم و رواج ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں، جب میں اپنے نوجوانوں کو موبائل اور اِنٹرنیٹ وغیرہ پر وقت ضائع کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو دِلی اذیت اور تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ کیا محمد علی جناح نے کبھی سوچا تھا کہ جس دو قومی نظریے کی بنیاد پر پاکستان معرض وجود میں آیا ہے اس دو قومی نظریے کا تشخص برقرار بھی رہ پائے گا یا نہیں؟

ہم وقت کی دوڑ میں بھاگتے بھاگتے بھول ہی گئے کہ نظریۂ پاکستان میں ہی بقائے پاکستان کا راز پوشیدہ ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ستم تو یہ ہے کہ آج ہمارے بہت سے کم عقل مسلمان بہن بھائی کہتے نظر آتے ہیں کہ 'پاکستان بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی!؟ اچھا بھلا تو ہم سب ساتھ رہ رہے تھے'۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا دل کو کوئی کند چھری سے کاٹ رہا ہے۔''

دادا جان تھک کر خاموش ہو گئے اور آنسو صاف کرتے ہوئے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لیا۔

''دادا جان! میں بہت شرمندہ ہوں اور آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ اب آئندہ کبھی میں ان فضول چیزوں میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔''

احسن نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

''شاباش بیٹا! بس ہمیں اپنے ملک اپنی مٹی کے لیے اسی اخلاص کی ضرورت ہے۔''

دادا جان پیار سے احسن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

شکر پارے

قارئین

☆ ''کیا مکینک نے تمھیں سب سمجھا دیا ہے؟'' کام ختم ہونے کے بعد فورمین نے نئے ہیلپر سے پوچھا، جس کا آج پہلا دن تھا۔

''جی ہاں جناب! اس نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔'' ہیلپر نے جواب دیا۔

''بہت خوب!'' فورمین خوش ہوا۔ ''کیا کیا بتایا تھا؟''

''جناب! اس نے کہا تھا کہ جب میں آپ کو آتا دیکھوں تو اُسے فوراً جگادوں۔''

(محمد ریان بن محمد زوہیب۔ کراچی)

☆ سرکس کا مالک (نوکر کو ڈانٹتے ہوئے):

''لاپروائی کی بھی حد ہوتی ہے۔ تم نے شیر کو کھلا چھوڑ دیا۔''

نوکر: ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے! شیر کو بھلا کون چوری کر سکتا ہے؟''

(ضحیٰ بنت عبدالمنان۔ کراچی)

☆ ایک پرچے میں سوال آیا کہ پینٹر کسے کہتے ہیں۔ ایک بچے نے بڑا مدلل جواب دیا:

''میرے خیال میں پینٹر بھی ''پ'' سے شروع ہوتا ہے اور پینٹ بھی، اس لیے مجھے لگتا ہے کہ پینٹ سینے والے کو پینٹر کہتے ہیں۔

(محمد شایان۔ حیدر آباد)

☆ ڈاکٹر (مریض سے):

''میں نے آپ کو اپنے ایک سال کے بچے والی خوراک کھانے کو کہا تھا۔ کیا آپ نے کھائی؟''

مریض: ''جی ہاں، کھائی۔''

ڈاکٹر: ''کیا کیا کھایا؟''

مریض: ''نارنگی کے چھلک، تھوڑی سی مٹی اور کچھ کاغذ کے ٹکڑے۔''

(نازیہ سلمان۔ اسلام آباد)

☆ کلرک نے نئے چپڑاسی سے دریافت کیا:

''کیا صاحب اندر موجود ہیں؟''

جواب میں چپڑاسی نے کلرک سے پوچھا:

''پہلے یہ بتائیے کہ آپ سیلز مین ہیں، کوئی کمپنی ایجنٹ ہیں یا صاحب کے کوئی دوست ہیں؟''

کلرک کو غصہ آ گیا اور وہ بولا:

''میں یہ سبھی کچھ ہوں، اب بتاؤ، کیا کہتے ہو؟''

چپڑاسی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا:

''اگر آپ سیلز مین ہیں تو صاحب میٹنگ میں ہیں، انتظار کریں یا پھر کبھی اور آجائیں۔

اگر آپ کمپنی ایجنٹ ہیں تو آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ آج صاحب سے ملاقات نہ ہو سکے گی، کیوں کہ صاحب شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔

اور ہاں، اگر آپ صاحب کے دوست ہیں تو میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں، اندر تشریف لے جائیے، صاحب تشریف فرما ہیں۔''

☆ ڈاکٹر: ''یہ آپریشن بہت خطرناک ہے۔ سو میں سے نوے آدمی مرجاتے ہیں۔ آپریشن شروع کرنے سے پہلے مجھے یہ بتائیے کہ میں آپ کے لیے کیا کروں؟''

مریض: ''صرف یہی کہ میری چھڑی اور جوتے دے کر کمرے سے باہر جانے کا راستہ بتا دیجیے۔''

(عامر اعجاز۔ کوہاٹ)

☆ منّی: ''بھیا! میرا دانت ہل رہا ہے۔ بسکٹ کھایا ہی نہیں جا رہا؟''

بھیا: ''ارے، اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ لاؤ، مجھے دے دو، میں کھا لیتا ہوں۔''

☆ پہلا دوست:

''یہ چیونٹیاں بھی عجیب ہیں، بس ہر وقت کام میں لگی رہتی ہیں۔ ان کی زندگی میں تو تفریح ہے ہی نہیں۔''

دوسرا دوست:

''میں نہیں مانتا، ہم جب بھی پکنک پر گئے ہیں، انھیں وہاں پہلے سے موجود دیکھا ہے۔''

(ماہین ذاکر۔ دبئی)

ایجاد کی چوری

محمد ایوب۔ کراچی

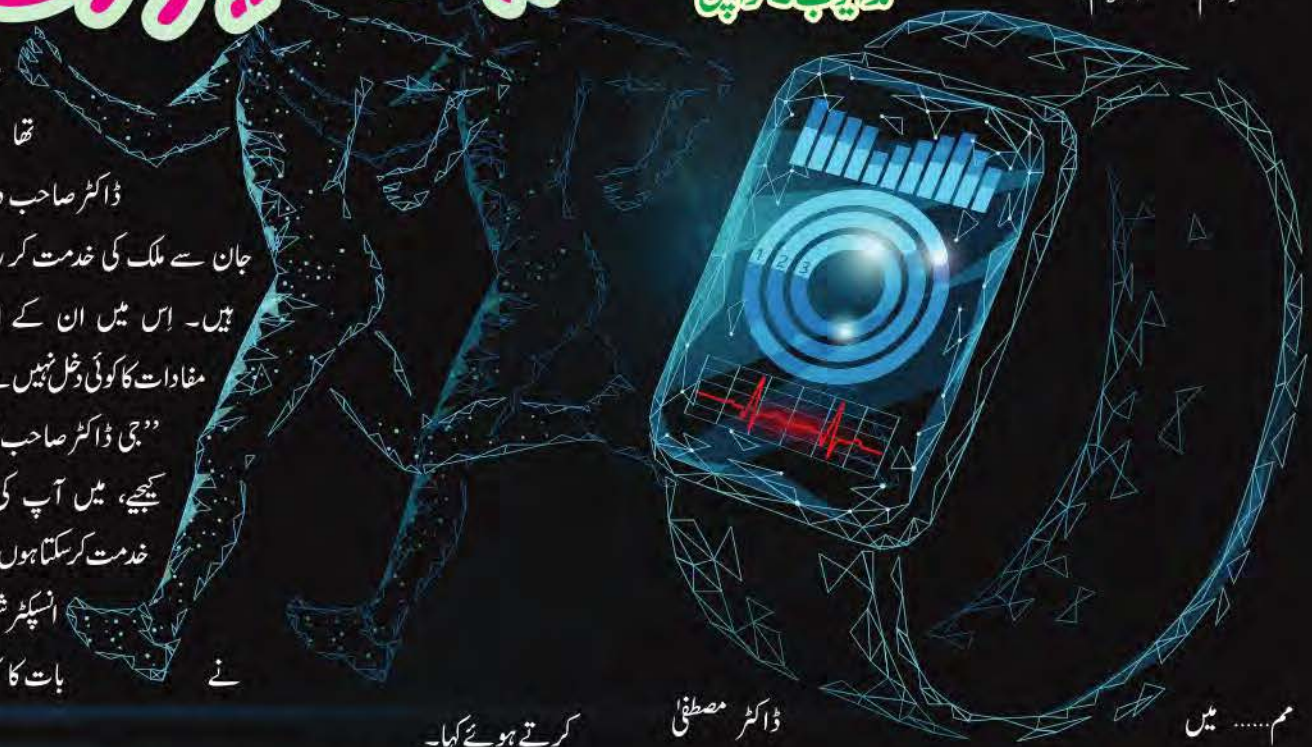

رات کی تاریکی اپنی ہول ناکی کا ثبوت دے رہی تھی۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا، چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ خوف کے عالم میں کپکپاتے ہوئے وہ تیزی سے چلتا جا رہا تھا۔ تاریکی میں کافی دیر چلتے ہوئے وہ ایک خوف ناک حویلی کے سامنے آ کر رُکا اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا، پھر کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد تیز تیز ڈگیں بھرتا ہوا عمارت میں داخل ہو گیا۔

.....☆.....

''ٹرن.....ٹرن.....ٹرن.....''

فون کی گھنٹی بجنے پر اِنسپکٹر شہزاد کو ناشتے کی میز سے اُٹھنا پڑا۔

''السلام علیکم! جی کون؟''

''وعلیکم السلام!

مم..... میں ڈاکٹر مصطفیٰ سلطان۔''

''اوہ، یعنی میں اس وقت ملک کے مشہور سائنس دان سے بات کر رہا ہوں۔''

''جج.....جی ہاں!''

ڈاکٹر صاحب بڑبڑائے۔

''لیکن یہ آپ کی آواز میں اتنی گھبراہٹ کیوں ہے؟''

''وہ.....وہ میں بہت پریشان ہوں، مجھے آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ براہِ مہربانی، آپ میرے گھر آ جائیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں تھوڑی دیر میں پہنچتا ہوں۔''

فون بند کر کے انھوں نے ضروری سامان اُٹھایا اور تیزی سے گھر سے نکل گئے۔

''ارے، ارے، ناشتا تو کرتے جایئے۔''

اُن کی بیگم پکارتی رہ گئیں۔

کچھ ہی دیر میں انسپکٹر شہزاد، ڈاکٹر مصطفیٰ کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ گھر درمیانہ اور سادہ سا تھا، ہر چیز انتہائی سلیقے سے رکھی گئی تھی۔ گھر دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب دل و جان سے ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ اِس میں ان کے اپنے مفادات کا کوئی دخل نہیں ہے۔

''جی ڈاکٹر صاحب! حکم کیجیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

انسپکٹر شہزاد نے بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''انسپکٹر صاحب! معافی چاہتا ہوں، آج آپ کی چھٹی کا دن ہے اور میں نے آپ کو تکلیف دی۔''

''ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، میں تو خود کو کبھی فارغ سمجھتا ہی نہیں ہوں۔''

انسپکٹر شہزاد مسکرائے۔

''انسپکٹر صاحب! کافی عرصے سے میں ایک انوکھی گھڑی کی ایجاد کے سلسلے میں محنت کر رہا ہوں، جس کا آئیڈیا میں نے ایک پروگرام میں صدر صاحب کو دِیا تھا۔ اس کے بعد سے کچھ لوگ غیر محسوس طور پر مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ کل میں نے اپنی ایجاد مکمل کر لی اور وہ گھڑی اپنے ساتھ گھر لے آیا۔

صبح جب میں سو کر اُٹھا تو دیکھا کہ گھڑی میرے خفیہ لاکر سے غائب ہے۔ اگر وہ گھڑی دشمن ملک کے ہاتھ لگ گئی تو وہ ہمارے ملک کے سارے راز چُرا سکتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے ایک ہی سانس میں اپنی بات پوری کر دی۔

''یہ کیسے ممکن ہے ڈاکٹر صاحب!؟''

انسپکٹر صاحب چونک اُٹھے۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر صاحب کچھ کہتے ایک ملازم چائے کی ٹرے لیے کمرے میں آیا اور چائے میز پر رکھ کر اَدب سے کھڑا ہو گیا۔

''آپ ذرا باہر جائیں، ہم ضروری بات کر رہے ہیں۔''

انسپکٹر شہزاد اُس ملازم سے مخاطب ہو کر بولے اور پھر ڈاکٹر صاحب کی طرف متوجہ ہوئے:

''خیر، آپ یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے ملک کے راز چُرائے جا سکتے ہیں، مگر کیسے؟''

''وہ ایسے انسپکٹر صاحب! کیوں کہ وہ گھڑی دیکھنے میں تو گھڑی ہے، لیکن حقیقت میں وہ گھڑی نہیں ہے، بل کہ گھڑی نما ایک کڑا ہے۔ جب اسے کلائی پر باندھا جائے تو اِنسانی نبض سے لگ کر وہ آن ہو جاتا ہے اور اُس سے نکلنے والی شعاعیں پورے جسم میں پیوست ہو جاتی ہیں، جس سے آدمی دوسروں کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔''

''اوہ، اوہ! اب میں پورا معاملہ سمجھ گیا ہوں۔''

انسپکٹر شہزاد پریشان کن انداز میں بولے۔

''تو پھر جلدی کیجیے انسپکٹر صاحب! کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

ڈاکٹر صاحب بولے:

''ہاں، مجھے وہ گھڑی تلاش کرنا ہو گی، جس کا آغاز میں اسی گھر سے کروں گا اور سب سے پہلے میں آپ کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔''

انسپکٹر شہزاد، ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہو کر بولے۔

''لیکن میرے کمرے میں تو وہ گھڑی ہے ہی نہیں۔''

ڈاکٹر صاحب بے چینی کے عالم میں بولے۔

''میں اپنے اطمینان کے لیے آپ کے کمرے کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، چلیے میرے ساتھ۔''

ڈاکٹر صاحب جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''نہیں، کمرے میں صرف میں جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں، اوپر والی منزل پر پہلا کمرا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب دوبارہ سوفے پر بیٹھ گئے۔

انسپکٹر شہزاد نے کمرے میں آتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا اور ایک ایک چیز کو اچھی طرح چیک کرنے لگے۔ لمحہ بہ لمحہ اُن کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر کچھ سوچ کر اُنھوں نے پوری الماری خالی کر دی۔ اچانک اُن کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ انھوں نے کوئی چیز اُٹھا کر جیب میں ڈالی اور الماری درست کر دی، پھر کچھ اور چیزوں کو چیک کیا اور دروازہ کھول دیا۔

''ارے ڈاکٹر صاحب! آپ کب آئے؟''

انسپکٹر شہزاد نے ڈاکٹر صاحب کو دروازے کے پاس کھڑے دیکھ کر سوال کیا۔

''بس ابھی ابھی آیا ہوں، طبیعت بوجھل سی ہو رہی ہے، میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

ڈاکٹر صاحب نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ آرام کیجیے، میں چلتا ہوں۔ ان شاء اللہ! بہت جلد آپ کی گھڑی آپ کے ہاتھوں میں ہو گی۔''

انسپکٹر شہزاد نے پُرجوش لہجے میں کہا، پھر گھر کی دیگر چیزوں کا جائزہ لینے کے بعد ملازم سے چند باتیں کیں اور گھر سے نکل آئے۔

.....☆.....

گاڑی تیزی سے اُڑی جا رہی تھی۔ ہائی وے پر چلتے ہوئے اچانک گاڑی نے ایک موڑ کاٹا اور ویرانے پر چلنے لگی۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو ڈانو! تم کہاں ہو؟''

میں اڈّے پر جا رہا ہوں ڈالی!''

''ڈانو! کچھ بتایا اس نے؟''

''وہ تو بس ایک ہی بات کر رہا ہے کہ اسے کچھ پتا نہیں۔''

''ڈانو! میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمیں بڑی صفائی سے دھوکا دے رہا ہے۔ تم وہیں رہنا، میں کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچتا ہوں، ساری بات اُگلوا لوں گا اس سے۔''

''اگر وہ کچھ بھی بتانے پر آمادہ نہ ہوا تو ہم کیا کریں گے؟''

ڈانو نے سوال کیا۔

''اس صورت میں راتوں رات ہم اسے سمندر کے راستے سے شرستان پہنچا دیں گے۔''

ڈالی نے جواب دیا تو ڈانو نے فون بند کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں ڈانو، ڈالی، شیدا اور ایک چوتھا شخص ایک خوف ناک حویلی میں جمع ہو گئے۔

.....☆.....

''ٹرن.....ٹرن.....ٹرن.....''

صبح صبح انسپکٹر شہزاد نے ڈاکٹر صاحب کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ ملازم نے دروازہ کھولا۔

''جی انسپکٹر صاحب!؟''

''میں ڈاکٹر صاحب کے کمرے کی ایک بار پھر تلاشی لینا چاہتا ہوں۔''

انسپکٹر شہزاد مسکرائے۔

''ٹھیک ہے، آپ اندر آ جائیے، ویسے ڈاکٹر صاحب نہیں ہیں، وہ کچھ دیر پہلے ہی تجربہ گاہ گئے ہیں۔''

انسپکٹر شہزاد نے کمرے کی تلاشی لی، ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لیا، مختلف جگہوں سے انگلیوں کے نشانات (فنگر پرنٹس) بھی لیے، اس کے بعد تجربہ گاہ پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب یہاں بھی موجود نہ تھے۔ یہاں سے بھی کچھ جگہوں سے انگلیوں کے نشانات لیے اور لیب بھجوا دیے۔

شام تک رپورٹ کے ساتھ ساتھ کچھ اور مواد بھی ان کے ہاتھوں میں تھا۔ اب وہ بالکل پُرسکون ہو کر گھر آ گئے۔ اُنھیں اب بے چینی سے صبح کا انتظار تھا۔

.....☆.....

نمازِ فجر کے فوراً بعد ناشتے سے فارغ ہو کر اُنھوں نے ضروری سامان لیا اور گھر سے نکل گئے۔ ہائی وے پر برق رفتاری سے چلتے ہوئے ایک سنسان سڑک پر اُنھوں نے گاڑی کا رخ موڑ دیا۔

''ٹون ٹون ٹون ٹون.....''

اچانک ایک آواز گونجنے لگی، وہ حیران رہ گئے، کیوں کہ اپنا موبائل تو وہ گھر چھوڑ آئے تھے۔ اچانک ایک خیال آنے پر اُنھوں نے جیب سے کوئی چیز نکالی اور اُسے غور سے دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ گاڑی کو ایک محفوظ مقام پر روک کر وہ نہایت احتیاط سے قدم اُٹھانے لگے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد وہ ایک خوف ناک سی حویلی کے سامنے آ کر رُک گئے اور آس پاس کا جائزہ لینے لگے۔ کچھ سوچ بچار کے بعد اُنھوں نے بیگ سے ایک بڑا ہُک اور موٹی رسّی نکالی، پھر رسّی کو ہُک کے ساتھ انتہائی مضبوطی سے باندھ کر چھت پر اُچھال دیا اور بغیر کسی آواز کے چھت پر چڑھ گئے۔

دُور سے کچھ پتلے تار آ رہے تھے، جو مشکل ہی سے دکھائی دے رہی تھے، اُن تاروں کو کاٹ کر وہ سیڑھیوں کی طرف آئے، یہاں دروازے پر لگا تالا اُن کا منہ چڑا رہا تھا۔ آخر اُنھیں تالا توڑنا پڑا، جس سے کچھ آواز پیدا ہو گئی۔

سیڑھیوں سے اُتر کر وہ پہلی منزل کے ہال میں پہنچے، یہاں ایک کرسی پر ایک شخص نیم بے ہوشی کی حالت میں بندھا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اُس کی طرف دوڑے، لیکن اچانک دھڑام کی آواز کے ساتھ ہی وہ گر پڑے۔ اِسی اثنا میں ایک شخص نے اُن پر چھلانگ لگا دی۔ عین موقع پر اُنھوں نے کروٹ بدلی اور لات گھما دی، جس سے وہ شخص دیوار سے جا ٹکرایا۔ اگلے ہی لمحے انھوں نے کھڑے ہو کر اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ یکا یک تین کونوں سے تین آدمی اور نکل آئے۔ ان میں سے دو آدمی ایک ساتھ اچھل کر اُن کی طرف آئے، انھوں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، چت لیٹ گئے۔ وہ دونوں آپس میں ٹکرا گئے۔

''انسپکٹر صاحب! مجھے معاف کر دو۔''

چوتھا آدمی جو ایک طرف کھڑا تھا، گھبراتے ہوئے بولا۔

''جرم تو تم نے بھی کیا ہے، سزا تو ملے گی۔''

''نہیں انسپکٹر صاحب! میں غریب آدمی ہوں، ڈاکٹر صاحب کا ملازم ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے بڑی نوکری کا لالچ دیا اور یہاں لے آئے۔ یہ میرا پہلا جرم تھا، لیکن میں کام یاب نہیں ہو سکا۔''

انسپکٹر شہزاد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بولے:

''ٹھیک ہے، اگرچہ یہ خطرے سے خالی نہیں، لیکن میں یقین کر لیتا ہوں۔''

اس کے بعد دونوں نے مل کر اُن تینوں آدمیوں کو مضبوطی سے باندھ دیا۔

''تم اس شخص کو رسیوں سے آزاد کر دو، میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔''

اُنھوں نے کرسی پر بیٹھے شخص کی طرف اشارہ کیا اور دروازے کی طرف دوڑے۔ کچھ ہی دیر میں وہ واپس لوٹ آئے، اب تک وہ شخص مکمل ہوش میں آ چکا تھا۔ دونوں کو لے کر وہ سیدھے تجربہ گاہ پہنچے۔ عمارت میں موجود لوگوں کی گرفتاری کے لیے پولیس اسٹیشن فون کر کے اطلاع دی اور خود فیصلہ کُن مرحلے کی تیاری کرنے لگے۔

.....☆.....

''ٹرن.....ٹرن.....ٹرن.....''

ایک مرتبہ پھر انسپکٹر شہزاد، ڈاکٹر صاحب کے دروازے پر تھے۔ جلد ہی ملازم نے دروازہ کھولا اور اُنھیں بیٹھک میں لے آیا۔ بیٹھک میں

اس وقت ڈاکٹر صاحب، انسپکٹر شہزاد اور ملازم موجود تھے۔

کچھ ہی دیر میں شہر کے گورنر رشید نیازی صاحب اور اُن کے ساتھ کچھ آفیسرز تشریف لے آئے۔ بیٹھک میں مکمل خاموشی تھی۔ آخر انسپکٹر شہزاد نے اس خاموشی کو توڑا:

''ڈاکٹر صاحب! مبارک ہو، آپ کی گھڑی مل چکی ہے۔''

خبر ملتے ہی سب کے چہرے کھل اُٹھے۔

''لائیے دیجیے انسپکٹر صاحب! بہت بہت شکریہ!''

''ٹھیک ہے، یہ لیجیے۔''

انسپکٹر شہزاد نے جیب میں ہاتھ ڈالا، اگلے ہی لمحے ان کے ہاتھ میں پستول نظر آرہا تھا، جس کا رُخ ڈاکٹر صاحب کی طرف تھا۔

''ارے ارے، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

ڈاکٹر صاحب خوف کے عالم میں بولے۔

''ہاتھ اوپر اُٹھا دو۔''

یہ کہہ کر انسپکٹر شہزاد اپنی جگہ سے اُٹھے اور ڈاکٹر صاحب کے روپ میں بیٹھے شخص کو ہتھکڑی لگائی اور اُس کے چہرے سے نقلی میک اپ ہٹا دیا۔ اگلا لمحہ حیران کُن تھا، کیوں کہ وہ کوئی اور نہیں، بدنامِ زمانہ ڈاکوؤں کے گروہ ''ڈنگو گینگ'' کا باس پرویز تھا، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اسے دشمن ملک شرستان کی پشت پناہی حاصل ہے اور اِسے گرفتار کرنا ناممکن ہے، مگر آج انسپکٹر شہزاد نے ملک کے ہیرو ''ڈاکٹر مصطفیٰ سلطان'' کو بچانے کے ساتھ ساتھ ڈنگو گینگ کے سرغنہ کو گرفتار کر کے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔

''انسپکٹر صاحب! پھر ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟''

گورنر صاحب پریشانی کے عالم میں بولے۔

''میں یہاں ہوں۔''

ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب بیٹھک میں داخل ہوئے۔

''انسپکٹر صاحب! اب آپ اِس کیس کی تفصیل سنا دیجیے، مارے تجسّس کے میرا بُرا حال ہو رہا ہے۔''

گورنر صاحب بولے۔

''جی بالکل!''

انسپکٹر صاحب مسکرائے اور اپنی بات کا آغاز کیا:

''یہ آج سے تقریباً چھے ماہ پہلے کی بات ہے، جب ہمارے ملک کے مایہ ناز سائنس دان ''ڈاکٹر مصطفیٰ سلطان'' نے اپنی ایک ایجاد کے بارے میں صدر صاحب کو بتایا تھا، جس پر وہ کافی عرصے سے کام کر رہے تھے اور وہ ایجاد ہے یہ گھڑی۔''

یہ کہتے ہوئے انھوں نے جیب سے گھڑی اور ایک مخصوص ریموٹ کنٹرول نکالا اور بولے:

''حاضرین! یہ دیکھنے میں تو ایک گھڑی ہے، مگر یہ معمولی گھڑی نہیں ہے۔ اگر اِسے ہاتھ میں پہنا جائے تو رگوں سے لگ کر یہ آن ہو جاتی ہے، پھر اِس میں دو بٹن ہیں۔ سرخ بٹن کو دبانے سے اس میں

سے غیر شعوری طور پر شعائیں نکل کر پہننے والے کے جسم میں پیوست ہوجاتی ہیں اور وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے اور سبز بٹن دبانے سے وہ دوبارہ نظر آنے لگتا ہے۔''

''اوہ، اوہ!''

کئی آوازیں ایک ساتھ اُبھریں۔

انسپکٹر شہزاد ایک لمحے کے لیے رُکے اور پھر گویا ہوئے:

''اور یہ مخصوص ریموٹ ہے جس کا اس گھڑی کے ساتھ خاص تعلق ہے، وہ اس طرح کہ اگر یہ گھڑی کسی بھی سمت میں تین میل کے فاصلے پر ہو تو یہ ریموٹ، سگنل کے ساتھ رُخ بھی بتا دیتا ہے، جس سے پتا چل جاتا ہے کہ گھڑی کہاں ہے۔ اب میں اپنی اصل بات کی طرف آتا ہوں۔

جب ڈاکٹر صاحب نے صدر صاحب کو اپنی ایجاد سے آگاہ کیا تو اُسی وقت سے کچھ لوگوں نے غیر محسوس طور پر اُن کا تعاقب شروع کر دیا اور ایسا کرنے کے لیے انھیں دشمن ملک ''شرستان'' نے بھاری رقم دی تھی۔ وہ اِس گھڑی کو حاصل کر کے ہمارے اور دیگر اِسلامی ممالک کے کافی راز چُرا سکتا تھا۔

خیر، ڈاکٹر صاحب نے یہ گھڑی ایجاد کی اور تجربے کے بہانے مجھے بلایا اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد ہم نے میک اپ کے ذریعے ایک دوسرے کا روپ اختیار کیا، پھر ڈاکٹر صاحب رات گئے تجربہ گاہ کے خفیہ راستے سے نکل کر اِس گھڑی کو ہائی وے سے دو میل کے فاصلے پر موجود ایک ویران عمارت میں چھپا آئے، اِس دوران میں، میں برابر تجربہ گاہ میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے واپس آنے پر ہم نے اپنے حلیے تبدیل کیے اور اپنے اپنے گھروں کو چل دیے، البتہ ڈاکٹر صاحب نے یہ ریموٹ اپنے گھر میں ہی چھپایا، تاکہ معاملہ بگڑنے پر میں صورتِ حال سنبھال سکوں۔

کل صبح جیسے ہی مجھے گھڑی کے چوری ہونے کی اطلاع ملی میں فوراً یہاں آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب ضرورت سے زیادہ ہی پریشان ہیں، حالاں کہ گھڑی کے بارے میں ہم جانتے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے، پھر میں نے ڈاکٹر صاحب کے کمرے کی تلاشی لی اور یہ ریموٹ برآمد کر لیا اور ساتھ ساتھ ان کا فون ٹیپ کرنا شروع کر دیا، تاکہ فون پر ہونے والی ساری گفتگو گھر بیٹھے سُنی جا سکے۔ باہر آ کر ملازم سے اپنے شک کا اظہار کیا۔

میرا شک یقین میں اُس وقت بدلا جب فون پر ہونے والی گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس گھر میں ڈاکٹر صاحب کے حلیے میں کوئی اور ہے۔ ایک بار پھر میں نے کمرے اور تجربہ گاہ کی تلاشی لی اور مختلف جگہوں سے انگلیوں کے نشانات لیے اور لیب بھجوا دیے۔ رپورٹ آنے کے بعد ریکارڈ چیک کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ''ڈنگو گینگ'' کا سرغنہ ہے، جو ایک بار جیل سے فرار ہوا تھا، جس کے بعد سے اُس نے شرستان سے گٹھ جوڑ کر کے اُس کے لیے کام کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہوا ہے اور آج تک گرفتار نہیں ہو سکا۔

اب میرے پاس دو راستے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو تلاش کرتا یا پھر گھڑی کی حفاظت کا انتظام کرتا۔ کچھ سوچ بچار کے بعد میں نے گھڑی کی طرف رُخ کیا۔ عمارت میں پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ اِس کے ویران ہونے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہاں کچھ لوگوں نے بسیرا کیا ہوا ہے، چناں چہ سب سے پہلے میں نے ٹیلی فون کی لائن کاٹ دی اور عمارت کے اندر داخل ہوگیا۔ اتفاق سے وہاں موجود لوگ ''ڈنگو گینگ'' کے کارکن ہی تھے اور اُنھوں نے ڈاکٹر صاحب کو وہیں قید کر رکھا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ وہ کسی حویلی میں ہیں، مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اسی عمارت میں ہوں گے۔ خیر، میں نے ڈاکٹر صاحب کو رسّیوں سے آزاد کر کے ان لوگوں کی گرفتاری کا انتظام کیا۔ عمارت سے گھڑی تلاش کر کے ڈاکٹر صاحب اور اُن کی گھڑی کو لے کر تجربہ گاہ پہنچ گیا۔ یہ ہے اس پورے کیس کی تفصیل۔''

''انسپکٹر صاحب! مجھے خوشی ہے کہ آپ ملک و قوم کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے سے ذرا بھی نہیں کتراتے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں!؟''

ڈاکٹر صاحب آبدیدہ ہو کر بولے۔

''ارے نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ اس طرح مجھے شرمندہ مت کیجیے۔ یہ تو میرا فرض تھا جو میں نے پورا کیا، لیکن گورنر صاحب! اِس ملک دشمن غدار کو گرفتار کرنے کے لیے خصوصی وارنٹ جاری کرنے ہوں گے، جو شاید اِنتظامیہ ''شرستان'' کے دباؤ پر نہ کر سکے۔''

انسپکٹر شہزاد نے اپنی بات مکمل کی۔

''نہیں ایسا نہیں ہوگا!'' گورنر صاحب پُرجوش لہجے میں بولے۔ ''ہمارا ملک ایک مضبوط قوت رکھتا ہے۔ محض ایک دشمن کے دباؤ میں آ کر ہم اپنے اصولوں کا خون نہیں ہونے دیں گے۔ آج کے بعد ہر اُس شخص کو سزا دی جائے گی جو اِس ملک کی طرف میلی آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے گا۔''

گورنر صاحب کی بات سن کر سب کے چہرے کِھل اُٹھے، سوائے ایک چہرے کے جس چہرے سے پریشانی صاف چھلک رہی تھی۔

یہ ہے میرا

وطن

محمد شریف شیوہؔ۔ لاہور

رشکِ صد کہکشاں تیری پگ ڈنڈیاں
تیرے ذرات میں مہر کی ہے پھبن
میرے پیارے وطن!

تیرے موسم بھلے دل کشی سے بھرے
جو نظر دیکھ لے دل کی اُترے تھکن
میرے پیارے وطن!

نام تیرا جپیں دل کی سب دھڑکنیں
مل کے پھر یہ کہیں سارے باغ اور بن
میرے پیارے وطن!

شانِ چرخ و زمیں خوب تر ، دل نشیں
خلد سے بھی حسیں ترے سارے چمن
میرے پیارے وطن!

رات دن اور سحر بحر ، موجیں ، بھنور
تیری ہر چیز پر میرے دل کی لگن
میرے پیارے وطن!

چومے دھرتی تری مہر کی روشنی
کھیتیوں میں تری سبزگی کا ہے دھن!
میرے پیارے وطن!

آن لائن "بیستی"

راحت عائشہ۔ کراچی

چڑیوں کی چہچہاہٹ ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ہم جنگل کے کنارے پر بیٹھے تھے، لیکن سوچ رہے تھے کہ یہ چوں چوں نہ ہوتی تو شاید اچھا ہوتا! یہ چڑیاں آخر اِتنی زور سے کیوں چہچہاتی ہیں اور یہ ندی کے بہنے کی آواز، آخر یہ رُک کیوں نہیں جاتی، آخر کیوں؟

''کب سے یہ الارم بج رہا ہے! اٹھنا نہیں ہوتا تو یہ چھتیس الارم لگائے کیوں جاتے ہیں!''

ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ٹارزن کسی غار سے نکل کر ہمارے سامنے آ گیا ہے، کیوں کہ ہمارا کمبل ایک جھٹکے سے دور جا گرا تھا۔

ارے! یہ ٹارزن نہیں، ٹارزن کی اماں تھیں، یعنی ہماری اماں! (صرف چھے الارم کو چھتیس الارم کہنے والی ہماری اماں ہی ہوسکتی ہیں)۔

''نیک بختو! اسکول تو جانا نہیں ہوتا، کم از کم آن لائن کلاس ہی ڈھنگ سے لے لیا کرو۔ اماں ابا کے پیسے فیسوں میں جا رہے ہیں۔ یہاں صاحب زادوں کو اِتنی بھی فکر نہیں کہ وقت پر آنکھیں کھول کر موبائل ہی آن کر لیں۔ تمھاری کلاس شروع ہوئے دس منٹ ہو چکے ہیں۔''

اماں نے ہمارے ہاتھ میں موبائل پکڑایا۔

''واہ اماں! کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ اماں! یاد ہے، ایک وقت تھا، موبائل سے کتنی نفرت ہوا کرتی تھی آپ کو جب یہ ہمارے ہاتھ میں ہوا کرتا تھا۔ اب کرونا دل بَر کی وجہ سے آپ خود آنکھ کھلتے ہی ہمارے ہاتھوں میں موبائل تھما رہی ہیں!'' ہم نے شرارت سے کہا۔

اماں نے دانت کچکچا کر ہماری طرف دیکھا:

''بس باتیں بنوالو اِس سے، فوراً آن لائن ہو اور اُس کے بعد کمپیوٹر آن کر کے اس پر بیٹھو۔ ناشتا اب میں بریک میں کرواؤں گی۔''

ہماری اَماں نے ہمیں حکم دیا اور دوسرے کمرے میں چلی گئیں جہاں ہمارے دوسرے بہن بھائی آن لائن کلاس لے رہے تھے اور اَماں مانیٹر بنیں سب پر نظر رکھ رہی تھیں۔

ہم اتنی دیر میں اپنی گوگل کلاس روم میں پہنچ چکے تھے، جہاں ہمارے استاد صاحب بچوں کو نیند سے جگانے میں مصروف تھے۔ ہمارا مطلب ہے کہ پوچھ رہے تھے کہ ہم نے پچھلی کلاس میں کیا پڑھا تھا؟

یہ تو ہمیں بھی نہیں یاد تھا کہ ہم نے پچھلی کلاس میں کیا پڑھا تھا۔

''عبداللہ! آپ بتائیے، ٹیپو سلطان کا وہ مشہور مقولہ کیا تھا؟''

سر نے اچانک ہی اپنا رُخ ہماری طرف کر لیا۔

''مقولہ؟ مقو..... لا؟ ''لا'' کا مطلب تو نہیں ہو گیا، لیکن وہ تو عربی کی کلاس میں پڑھا تھا، پھر یہ مقولہ بھلا کیا بلا ہے؟ شاید ٹیپو سلطان کا کوئی ہتھیار ہو۔

''عبداللہ! میں آپ سے پوچھ رہا ہوں؟ کیا آپ سو رہے ہیں؟ اپنا مائیک کھولیے۔''

سر کی آواز پر ہم گڑبڑا گئے۔ وہ اس سے پہلے بھی شاید ہمیں آوازیں

دے چکے تھے۔ چیٹ باکس میں ہمارے ہم جماعتوں کے تبصرے (کمنٹس) موجود تھے۔

علی: ''سر! عبداللہ گیم کھیل رہے ہیں۔''

احمد: ''سر! عبداللہ آن لائن ہیں، لیکن شاید سو رہے ہیں۔''

''اُف!'' ہم ذرا سنبھلے۔

''سر! میرا مائیک خراب ہے۔ آواز نہیں جاسکتی۔'' ہم نے لکھا۔

''مائیک کھولیے۔ مجھے سب معلوم ہیں آپ لوگوں کی یہ حرکتیں! جو بچے مائیک نہیں کھول رہے یا آن لائن ہوتے ہوئے بھی سوال کا جواب نہیں دے رہے، میں ان سب کے والدین کو آج کال کروں گا۔''

سر نے دھمکی دی اور ہم سب کو یہ معلوم تھا کہ یہ گیدڑ بھبکی نہیں ہے، وہ اس پر عمل بھی کر گزریں گے۔ انھیں بھی ہمارے سارے حربے معلوم تھے اور معلوم کیوں نہ ہوتے، جہاں ہم پڑھتے ہیں وہاں وہ پڑھاتے ہیں۔

یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی، چیٹ باکس میں ہمارے ہم جماعتوں کے جوابات نظر آنے لگے۔

''اچھا جناب! ہم ٹیپو سلطان کی بات کر رہے ہیں، جن کے بارے میں ہم نے پچھلی کلاس میں پڑھا تھا۔ ان کا مشہور مقولہ، یعنی کہی ہوئی بات ہے کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

سر اَب اس مقولے کی وضاحت کر رہے تھے۔ ہم نے جلدی سے کمپیوٹر آن کیا اور منہ پر چھینٹے کر مار آئے اور اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ سسٹم سے کلاس آن کرتے ہوئے ہم نے موبائل آف کیا اور سر کی بات توجہ سے سننے لگے۔

ہم نے سبق کے دوران میں دوسرے ''ٹیب (Tab)'' پر اپنا پسندیدہ کھیل بھی کھول لیا۔ وہاں صرف ہم ہی نہیں، بل کہ ہمارے تین چار ہم جماعت بھی موجود تھے اور کھیل مزے سے جاری تھا۔

دوسرے کمرے سے امی کی آواز آرہی تھی، جس کا مطلب تھا کہ وہ کسی بھی وقت ہمارے کمرے میں آسکتی ہیں، کیوں کہ ان کا موبائل بھی اب تک یہیں تھا اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ ہم میں مزید آن لائن بے عزتی کروانے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔

جی ہاں، ابھی پچھلے ہفتے ہی کی بات ہے۔ ہم اسی طرح دوسرے ٹیب پر اپنے دوستوں کے ساتھ کوئی گیم کھیل رہے تھے۔ کلاس بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی کہ ہمارے بڑے بھائی جان دبے پاؤں چلتے ہوئے ہمارے پیچھے آن کھڑے ہوئے۔ ایک نظر اِسکرین پر ڈالنے کے بعد اُنھوں نے ایک ہاتھ سے ہمارا کان پکڑ کر اینٹھا اور دوسرے ہاتھ سے گدی پر دو ہاتھ جڑ دیے۔ شومئی قسمت کہ ان کے خوف سے گیم بند کرنے کی بجائے کیمرا آن ہو گیا تھا اور یوں ہماری پٹائی کا یہ منظر نہ صرف پوری کلاس نے آن لائن دیکھا تھا، بل کہ کلاس کی ریکارڈنگ کے دوران میں یہ ریکارڈ بھی ہو گیا تھا۔

کمپیوٹر کی اسکرین پر سر اَب پاور پوائنٹ پریزنٹیشن (PowerPoint Presentation) کے ذریعے سبق پڑھا رہے تھے۔

''اُف! کیا بوریت ہے؟'' ہم نے سوچا۔

ہم نے بوریت کے عالم میں سائیڈ پر آتی لسٹ میں اپنے ہم جماعتوں کے ناموں پر سرسری نگاہ ڈالی کہ آج کون کون حاضر ہے؟

''ارے یہ کیا! آج تو پرنسپل صاحب بھی ہماری جماعت میں ہیں۔'' ہم اچانک سنبھل کر بیٹھ گئے۔

''اوہ یہ کیا!؟ یہ تو ہمارے اسکول کی آئی ڈی کا لنک ہی نہیں لگتا۔ یہ کون ہے؟ اس کا نام بھی نظر نہیں آرہا۔ یہ ضرور کوئی ہیکر ہے اور سر کی نگاہ بھی ابھی تک اس پر نہیں پڑی ہے۔''

ہمارے اندر اِنسپکٹر جمشید کی روح بیدار ہو چکی تھی۔ یہ ضرور کوئی ہیکر ہے جو ہماری کلاس یا اسکول کے آن لائن سسٹم کو ہیک کر کے اسکول کے نام سے کوئی غلط کام کر سکتا ہے۔ ہمیں اسے روکنا چاہیے۔''

ہم نے خیالوں ہی خیالوں میں اپنے آپ کو اتھیکل ہیکر (Ethical hacker) تصور کیا، اور تو اور، تصور ہی میں ایک تقریب بھی دیکھنے لگے جس ہمیں میڈل اور تعریفی سند بھی دی جارہی تھی۔ تعریفی سند دینے والے اسکول کے پرنسپل صاحب تھے اور سامنے کرسیوں پر براجمان ہمارے امی ابو بڑے فخر سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

''عبداللہ بیٹے! آپ کا جواب ابھی تک نہیں آیا۔ چیٹ باکس میں، میں نے ایک لنک دیا ہے۔ جلدی سے اس لنک پر اَپنا جواب لکھیے۔''

سر کی مٹھاس بھری آواز نے ہمیں دوبارہ حقیقت کی دنیا میں لا پھینکا۔

ہم نے ایک نظر دوبارہ اس ہیکر کی آئی ڈی پر ڈالی اور اپنا مائیک آن کیا۔

''جی بتائیے۔'' آج تو سر بہت ہی خوش مزاجی سے بات کر رہے تھے۔

''سر! آپ میرے ساتھ مل کر ایک چور پکڑ سکتے ہیں؟''

''ہائیں! کیا مطلب!؟'' سر کا لہجہ لمحے بھر کو عجیب سا ہو گیا۔

''سر! آپ کو میرا ساتھ دینا ہے۔ سر! آپ جماعت میں موجود لوگوں کی لسٹ پر نظر ڈالیے۔ یہاں کوئی ہیکر گھس چکا ہے، جو نہ صرف ہماری جماعت کو، بل کہ ہمارے اسکول کے آن لائن سسٹم کو بھی ناکارہ بنا سکتا ہے۔'' ہم نے جوش سے کہا۔

''آں! ہاں، نن..... نہیں۔'' غالباً سر کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیں۔ ان کی آواز سے اب یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو ضبط کیے ہوئے ہیں۔

''نہیں عبداللہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ہیکر نہیں، بل کہ ہمارے گیسٹ ہیں جو آج انسپیکشن کے لیے ہماری آن لائن کلاس میں آئے ہوئے ہیں۔''

ہم پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا!

''افوہ! تو یہ بات تھی۔ سب بچوں کو یہ بات پتا تھی، اسی لیے سارے بچے بڑھ چڑھ کر جواب دے رہے تھے۔''

''چلیے عبداللہ! جلدی سے اب آپ اپنا جواب تحریر کیجیے۔''

سر کی آواز کی خوش مزاجی کی وجہ بھی اب ہم سمجھ چکے تھے، لہٰذا شرافت سے چیٹ باکس سے لنک پر کلک کر کے سر کے دیے گئے سوالات کے جوابات تحریر کرنے لگے، لیکن ہماری آنکھیں مستقبل میں اپنے ہم جماعتوں سے ہماری درگت بنتی دیکھ رہی تھیں۔

یوں ہماری ایک مرتبہ پھر آن لائن ''بیستی'' ہو چکی تھی۔

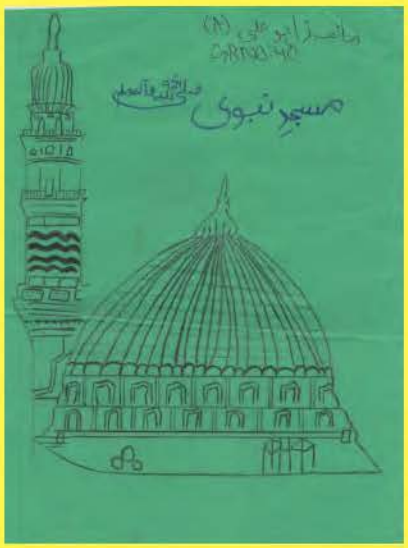

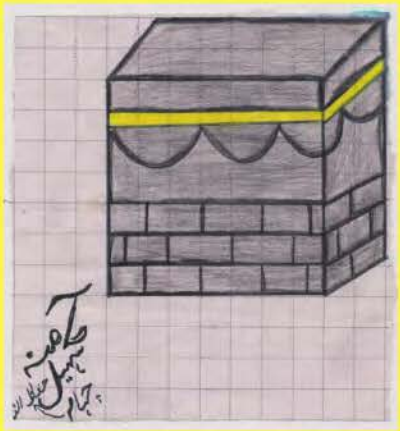

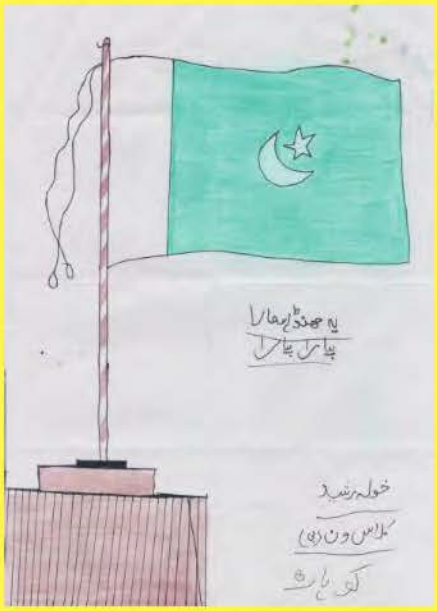

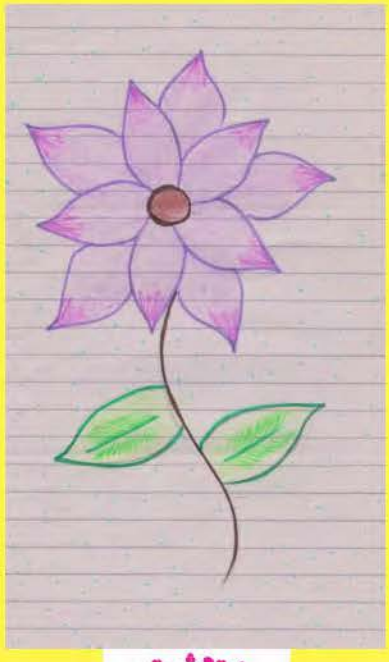

قرآن کوئز ۱۲

سعد علی چھیپا۔ کراچی

عزیز قارئین! پیشِ خدمت ہے ایک نیا انعامی سلسلہ بنام ''قرآن کوئز''، جس میں آپ سے اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ''قرآن کریم'' کے بارے میں پانچ سوال پوچھے جائیں گے۔ صحیح جواب دینے پر آپ کو ملے گا بہترین انعام.....

تو دیجیے جواب اور لیجیے انعام.....

آپ کا جواب کوپن کے ساتھ ۳۱، اگست ۲۰۲۱ء تک ہمیں مل جانا چاہیے۔

سوال

۱ دوسرے پارے میں سورۂ بقرہ کی کتنی آیتیں ہیں؟

۲ سورۂ آل عمران کس پارے میں ختم ہوتی ہے؟

۳ سورۂ ''دہر'' کا دوسرا نام کیا ہے؟

۴ قرآن مجید میں لفظ ''اِذَا'' سے کتنی سورتیں شروع ہوتی ہیں؟

۵ آیۃ الکرسی، قرآن مجید کی کس سورت میں ہے؟

بیس سال بعد

ن۔ش۔خان۔لاہور

رات کا تاریک سماں، موسلا دھار بارش اور گھنا جنگل۔ اس صورتِ حال میں اس کا آگے بڑھنا محال تھا۔

''یا اللہ! تُو ہی مددگار ہے، تیرے سوا کون ہے جو بے گھر مسافر کو منزل پر پہنچا سکتا ہے۔ یا اللہ! تُو ہی کوئی راستہ دکھا اور اِس بھٹکے ہوئے مسافر کو منزل مقصود پر پہنچا دے۔'' بہرام کے ہونٹوں سے بے اختیار دُعا نکلی۔

اچانک تیز بجلی چمکی، روشنی کا ایک جھماسا ہوا اور اِسی روشنی میں اسے قریب ہی ایک بڑا ٹیلا نظر آیا، جس کی چوٹی پر ایک گھنا درخت تھا۔

بہرام اللہ کا نام لے کر اُس ٹیلے کی طرف چل پڑا، کیوں کہ اس موسلا دھار بارش میں کیڑے مکوڑوں سے بھرے اس جنگل میں ٹھہرنا خطرناک ہوسکتا تھا۔

بہرام کئی سالوں سے کسی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا، مگر اُس کا مقصد ابھی تک حاصل نہ ہوسکا تھا۔ بھٹکتے بھٹکتے جب وہ تھک جاتا اور اُس کا حوصلہ ٹوٹنے لگتا تو وہ خود کو حوصلہ دیتا اور اُس کے اپنے کہے الفاظ پھر اُس کے اندر توانائی بھر دیتے اور وہ دوبارہ متحرک ہوجاتا۔

ابھی بھی وہ اپنا حوصلہ بڑھاتا قدم قدم اس درخت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گھنے جنگل میں گونجتے اس کے الفاظ اس کے تھکے قدموں میں تیزی پیدا کر رہے تھے:

''اے بھٹکتے مسافر بہرام! مسلمان کی شان نہیں کہ وہ مایوس ہوجائے، کیوں کہ اس کے پاس وہ ذات ہے جو ہر ناممکن کو ممکن میں بدل سکتا ہے۔ وہ..... وہ ذات ہے جو گھٹا ٹوپ اندھیروں کو روشنی کی ایک کرن سے نئی صبح میں اور ہر مشکل کو آسانی میں بدل سکتا ہے۔''

اوہ! شاید یہاں کوئی رہتا ہے۔ ٹیلے پر موجود درخت سے آتی ٹمٹماتی روشنی سے بہرام بے حد خوش ہوا۔ وہ دراصل ایک پرانا اور بہت گھنا درخت تھا جس کا چوڑا تنا کھلا تھا۔ شاید یہ کسی کا مسکن تھا، کیوں کہ اندر سے ہلکی ہلکی روشنی باہر آرہی تھی۔

''کوئی ہے؟ کوئی ہے؟ میں ایک مسافر ہوں۔ راستہ بھٹک گیا ہوں۔ خدا کے لیے میری مدد کیجیے۔'' بہرام نے بلند آواز میں درخواست کی، مگر اندر سے کوئی جواب نہ پا کر وہ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوگیا۔

اندر ایک شخص دوسری جانب رخ کیے نماز میں مشغول تھا۔ بہرام خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا اور اُس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ سارے دن کی تھکن سے چُور جسم کو تھوڑا سا آرام ملا تو حواس پر خود بخود نیند طاری ہونے لگی، مگر ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ ایک رعب دار غصے سے بھری آواز نے اس کے دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا:

''کون ہو تم!؟ اور کیوں میری عبادت میں خلل ڈال رہے ہو؟''

بہرام ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا، مگر اُس شخص کے چہرے پر نظر پڑتے ہی جیسے اس کی برسوں کی تھکن اور مشقت، پل بھر میں زائل ہوگئی، خوشی سے اس کا چہرہ چمک اٹھا، گویا اسے اس کا مقصد مل گیا ہو۔

وہ..... وہ میں.....'' بہرام تھوڑا سا ہچکچایا، مگر پھر اپنی ہچکچاہٹ پر قابو پا کر بولا:

''جناب! میں ایک بھٹکا ہوا مسافر ہوں اور کسی کی تلاش میں کئی سالوں سے بھٹک رہا ہوں۔ تیز بارش اور رات کی تاریکی میں اس گھنے جنگل میں سفر کرنا خطرناک ہے، اس لیے مہربانی فرما کر مجھے رات یہاں گزارنے کی اجازت دے دیجیے۔''

''ہرگز نہیں! میں اکیلا رہتا ہوں اور کسی دوسرے کو میں برداشت نہیں

کرسکتا۔'' اس بوڑھے شخص نے دوٹوک الفاظ میں صاف انکار کردیا۔

''جناب! اللہ آپ کی عبادتوں اور ریاضتوں کو قبول فرمائے۔ مجھ غریب پر کچھ رحم فرمایئے۔'' بہرام نے التجا کی۔

''اچھا ٹھیک ہے، مگر اِس شرط پر کے تم میری عبادت میں خلل نہ ڈالو گے۔''

بوڑھے شخص کا دِل کچھ نرم ہوا اور بہرام کلمہ شکر ادا کرتے ہوئے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ نیند اُس کی آنکھوں سے اُڑ چکی تھی۔ بہرام نے بوڑھے شخص کی طرف دیکھا، جو اَب مراقبے کی حالت میں بیٹھا ذکر و اَذکار میں مشغول تھا۔ ٹمٹماتے دیے کی مدھم روشنی بھی اس کے چہرے کی سختی کو واضح کررہی تھی۔ بہرام ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور اُس کے ذہن میں باری باری کچھ اور چہرے بھی ابھر رہے تھے، جن کی نظریں منتظر اور لب کسی آمد کے لیے ہر وقت دعا گو رہتے تھے۔

''جناب! اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک سوال پوچھوں؟'' جوں ہی بوڑھے شخص نے ذکر و اَذکار بند کیا بہرام نے موقع غنیمت جان کر فوراً سوال کر ڈالا، مگر دوسری طرف خاموشی ہی تھی اور چہرے کی سختی مزید بڑھ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ انکار کرتا بہرام نے جھٹ سے دوسرا سوال کر ڈالا:

''جناب! میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کب سے یہاں عبادت اور ریاضت میں مشغول ہیں؟''

''میں بیس سال سے یہاں عبادت کررہا ہوں اور اِن بیس سالوں میں تم وہ پہلے شخص ہو جو مجھے تنگ کرنے چلے آئے ہو۔'' بوڑھے شخص نے بہرام کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

''مگر کیوں؟ آپ لوگوں سے دور جنگل بیابان میں ان عبادتوں سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟'' بہرام نے حیرت کا اظہار کیا۔

بوڑھے شخص نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو، پھر غصے سے بولا:

''ظاہر ہے کہ میں اپنے رب کی رضا کا متلاشی ہوں اور اَپنے رب کو پانا چاہتا ہوں۔''

''تو کیا آپ نے اپنے رب کو پالیا؟''

بہرام نے ایک اور سوال کیا، جسے سُن کر بوڑھے کے چہرے کی سختی کچھ کم ہوئی اور وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا:

''پتا نہیں، مگر میرے دل کی بے چینی پہلے دن کی طرح ابھی تک جوں کی توں قائم ہے۔ میں ہر روز اپنی ریاضت اور مشقت بڑھاتا ہوں کہ شاید کچھ سکون ملے، مگر پھر وہی بے چینی، پھر وہی بے سکونی ہے۔ شاید میرا رب مجھ سے ناراض ہے۔''

''میں جانتا ہوں، کیوں کہ آپ غلط جگہ اور غلط طریقے کا انتخاب کر بیٹھے ہیں۔ بھلا اِس جگہ پر آپ اپنے رب کو کیسے راضی کرسکتے ہیں؟''

''کیا مطلب!؟'' بوڑھا حیران ہوا۔

''مطلب یہ کہ میں ایسی جگہ اور طریقے جانتا ہوں جہاں آپ اپنے رب کی رضا پاسکتے ہیں۔'' بہرام نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کیا واقعی! ایسی کوئی جگہ اور طریقے ہیں؟'' بوڑھے شخص کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔

''بالکل ہے! اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اُس جگہ پہنچا سکتا ہوں۔''

مگر میں تمھارا اعتبار کیوں کروں؟'' بوڑھے نے شک بھری نظروں سے اسے گھورا۔

''اعتبار تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا، کیوں کہ میرے بغیر آپ وہاں پہنچ نہیں سکتے۔'' بہرام نے مسکرا کر کہا اور اِطمینان سے سونے کے لیے لیٹ گیا۔

بوڑھا تلملا کر اپنی جگہ پر واپس بیٹھ گیا، مگر اَب وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا، جیسے کوئی فیصلہ کررہا ہو۔

اگلی صبح جب بہرام کی آنکھ کھلی تو اُس نے بوڑھے کو بے چینی سے ٹہلتے ہوئے پایا۔

''میں تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ کیا تم مجھے واقعی وہاں لے چلو گے؟''

بوڑھے شخص نے بہرام کو اٹھتے دیکھا تو بے صبری سے بولا۔ بہرام اس کی بے صبری دیکھ کر مسکرا دیا اور بولا:

''ہاں، مگر میری ایک شرط ہے!''

''شرط..... کیسی شرط؟'' بوڑھے شخص کو کچھ کھٹک سی ہوئی۔

''شرط یہ ہے کہ دورانِ سفر میں آپ کو میری ہر بات ماننا پڑے گی۔'' بہرام نے اپنی شرط بتائی۔

''ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔'' بوڑھے نے رضامندی ظاہر کی اور پھر دونوں نے اپنا سفر شروع کردیا۔

''رکو، اس راستے سے مت جاؤ۔ یہ راستہ آبادی سے ہو کر گزرتا ہے۔ ہمیں ویران راستے سے جانا چاہیے۔'' بوڑھا شخص بولا۔ وہ اکیلے رہتے

رہتے شاید آدم بے زار ہو چکا تھا، اس لیے آبادی سے گزرنا اسے ناگوار گزرا۔

''جناب! جس جگہ میں آپ کو لے کر جا رہا ہوں اس کا راستہ یہیں سے ہو کر گزرتا ہے، لہٰذا آپ کو اسی راستے سے چلنا ہوگا۔'' بہرام نے مسکرا کر کہا اور آگے چل پڑا۔ بوڑھا شخص بھی بے دلی سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس کے چہرے پر بے زاری اور سختی صاف نمایاں تھی۔

اب وہ جنگل سے گزر رہے تھے۔ گزشتہ رات طوفانی بارش اور تیز آندھی نے کئی درخت اپنی جگہ سے اکھاڑ پھینکے تھے۔ اچانک بہرام کی نظر ایک ہرن کے بچے پر پڑی جو بے چینی سے ایک گرے ہوئے درخت کے ارد گرد منڈلا رہا تھا۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی ماں اس درخت کی شاخوں میں بُری طرح پھنسی ہوئی ہے۔

''آیئے جناب! اس معصوم کو اس کی ماں سے ملاتے ہیں۔'' بہرام اپنی آستینیں بازوؤں پر چڑھاتے ہوئے درخت کی طرف بڑھا۔

''مگر یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ ہمیں اپنا سفر جلد از جلد ختم کرنا ہے۔'' بوڑھا بے زاری سے بولا۔

''جناب! آپ اپنا وعدہ بھول رہے ہیں۔ اگر آپ اپنی منزل پر پہنچنا چاہتے ہیں تو مہربانی فرما کر میری مدد کیجیے۔'' بہرام نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا تو مجبوراً بوڑھے شخص کو بہرام کی بات ماننی پڑی۔ بہرام نے اپنے مضبوط بازوؤں سے درخت کو اُوپر اُٹھایا اور بوڑھے کو اشارہ کیا۔ بوڑھا شخص بے دلی سے ہرنی کو شاخوں سے چھڑانے لگا۔

ہرن کا بچہ جو بڑی بے چینی سے بوڑھے کے گرد منڈلا رہا تھا اپنی ماں کے آزاد ہوتے ہی اسے پیار کرنے لگا۔ وہ دونوں، ماں بچے کے اس ملاپ کو دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک ہرنی بوڑھے کے قریب آئی اور اپنا سر اُس کے ہاتھوں پر رگڑنے لگی، جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو یا اس سے محبت کا اظہار کر رہی ہو۔ بوڑھا شخص بہت حیران ہوا۔ اسے ایک جانور سے ایسی توقع بالکل نہ تھی۔ وہ بھی اَز راہِ شفقت ہرنی کی پیٹھ سہلانے لگا۔ ہرنی نے مشکور نظروں سے اسے دیکھا اور اپنے بچے کے ساتھ جنگل میں چلی گئی۔ بہرام نے دیکھا کہ بوڑھا شخص ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے ہرنی کو جاتا دیکھ رہا تھا اور شاید یہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بیس سالوں میں پہلی بار آئی تھی۔

''جناب! چلیں؟'' بہرام نے اسے متوجہ کیا۔

''آں..... ہاں، چلو۔'' بوڑھے شخص نے چونک کر کہا اور چہرے پر پھر وہی سختی لا کر بہرام کے پیچھے چل دیا۔ آگے ایک گاؤں سے گزرتے ہوئے بہرام کی نظر ایک کم سن بچے پر پڑی جو خود سے دوگنا بوجھ اٹھائے کافی مشکل سے چل رہا تھا۔ دراصل وہ پانی سے بھرے دو مشکیزے تھے، جس میں سے ایک اس بچے نے اپنی کمر پر لاد رکھا تھا اور دوسرے کو وہ اپنے ہاتھوں سے گھسیٹتا ہوا بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔

''اے ننھے محنت کش ماشکی! کیا میں تمھاری کچھ مدد کر سکتا ہوں؟'' بہرام نے از راہِ مذاق بچے کو ماشکی کہہ کر مخاطب کیا۔

بچہ اس پیشکش پر کِھل اٹھا اور بڑے ادب سے بولا:

''جی چچا جان! ضرور! مہربانی فرما کر اِن وزنی مشکیزوں کو میرے گھر تک پہنچا دیجیے۔ ان مشکیزوں نے تو مجھے تھکا دیا ہے۔ بڑی مشکل سے انھیں یہاں تک گھسیٹ کر لایا ہوں۔ اب تو مارے تھکن کے ایک قدم بھی چلنا محال ہو رہا ہے۔''

بچے کی اس لمبی چوڑی وضاحت نے بہرام کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے دونوں مشکیزوں کو اپنی کمر پر لادا اور بچے کو کمر سے پکڑ کر بوڑھے شخص کے کندھوں پر بٹھا دیا۔ بوڑھا اس اچانک اور غیر متوقع کارروائی پر تلملا کر رہ گیا، مگر پھر اپنے غصے کو دباتے ہوئے بہرام کے کان میں سرگوشی کی:

''نہ جانے اس بچے کا گھر کتنی دور ہے۔ سوچو، اس طرح تو ہم اپنی منزل سے مزید دور ہو جائیں گے۔''

''جناب! یقین مانیے، اس معصوم بچے کی مدد ہمیں منزل کے اور قریب کر دے گی۔'' بہرام نے بھی بوڑھے کے کان میں سرگوشی کی اور اِطمینان سے آگے چل دیا۔

بچہ، بوڑھے شخص کے کندھوں پر سوار اُسے بتا رہا تھا کہ اپنے بڑے بھائی کے بیمار ہونے کی وجہ سے آج اسے پانی لینے آنا پڑا، مگر بوڑھا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا سخت جھنجھلایا ہوا لگ رہا تھا، مگر پھر اُسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب بچے کی معصومانہ باتوں میں وہ ایسا گم ہوا کہ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ کی جگہ گہری مسکراہٹ نے لے لی اور اِس مسکراہٹ نے بہرام کو بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

''شکریہ چچا جان!'' بچے نے بہرام کا شکریہ ادا کیا اور بوڑھے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کے گلے لگ گیا۔ بچے کے اس محبت بھرے والہانہ انداز نے بوڑھے کی آنکھوں کو نم کر دیا۔ ایک بھولی بسری یاد ماضی کے دریچوں سے نکل کر اُس کے ذہن کے پردوں پر لہرا گئی کہ اس کی گود میں بھی ایک چھوٹا سا بچہ تھا اور وہ اسی طرح آنکھوں میں نمی لیے اس کی پیشانی چوم رہا تھا۔

''جناب! چلیں، ابھی بہت سفر باقی ہے۔ بہرام نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو خیالوں میں گم بوڑھے شخص نے چونک کر بہرام کی طرف دیکھا، پھر مسکراتے ہوئے بچے کی پیشانی چوم لی۔

آگے کا سفر کافی خوش گوار ماحول میں طے ہونے لگا، اَب دونوں میں ہلکی پھلکی بات چیت بھی ہو رہی تھی۔

''بیٹا! تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم کس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہو؟'' بوڑھے نے تجسس سے پوچھا۔

''جناب! جہاں آپ کو آپ کی منزل ملے گی وہیں مجھے میرا مطلوب بھی مل جائے گا۔'' بہرام نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کیا مطلب!؟'' بوڑھے نے حیرت سے پوچھا۔ اچانک انھیں کچھ شور سا سنائی دیا۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو دو نوجوان بُری طرح آپس میں گتھم گتھا نظر آئے۔ لوگ اس لڑائی کا مزہ لے رہے تھے اور کوئی ایسا نہ تھا جو اُن کے بیچ صلح کروادے۔

''جناب! آپ بڑے ہیں، آگے بڑھیں اور ان کی لڑائی ختم کروائیں۔''

بہرام نے ایک بار پھر اپنی فطرت سے مجبور ہو کر گزارش کی۔ اس مرتبہ بوڑھے شخص نے کوئی پس و پیش نہ کی اور لڑنے والوں کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں نوجوان معذرت خواہانہ انداز میں ایک دوسرے کے گلے لگ رہے تھے اور بار بار بوڑھے شخص کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔

''جناب! یہاں ہے آپ کی منزل۔''

ایک بستی میں پہنچ کر بہرام نے گویا انکشاف کیا۔ بوڑھا شخص بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ وہ حیرت زدہ سا ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ بے شک بہت وقت گزر چکا تھا اور بلاشبہ بہت سی تبدیلیاں رونما ہو گئی تھیں، مگر وہ آج بھی اپنے گاؤں کو بخوبی پہچان سکتا تھا۔

''یہ..... یہ تو میرا گاؤں ہے۔'' اس کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کا وجود بھی کانپ رہا تھا۔

''جی جناب!

اور وہاں نہر کے پار.....''

''نہر کے پار میرا گھر ہے۔'' بوڑھا، بہرام کی بات کاٹ کر جلدی سے بولا اور بے اختیار نہر کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ پورے سفر کی تھکاوٹ جیسے غائب ہو گئی تھی۔ بوڑھا شخص بے تحاشا اپنے گھر کی طرف بھاگا جا رہا تھا، مگر پھر اچانک وہ رک گیا اور اپنے پیچھے آتے بہرام کی طرف مڑ کر غور سے اسے دیکھنے لگا۔

''مگر تم کون ہو؟ اور میرے گھر تک مجھے کیوں لائے ہو؟'' بوڑھا شخص بڑی گہری نظروں سے بہرام کو دیکھ رہا تھا۔

''میں ں ں.....'' بہرام نے ایک لمبا سانس لیا، پھر کہنا شروع کیا:

''میں آپ کا بیٹا ہوں بابا جان! جس نے اپنی زندگی کے کئی سال آپ کے انتظار میں گزار دیے۔ ہر خوشی، ہر غم کے موقع پر مجھے آپ یاد آتے تھے اور صرف میں ہی نہیں، آپ کی بیوی اور آپ کے بوڑھے ماں باپ بھی آج تک آپ کے منتظر ہیں۔ آپ اپنے رشتوں کو بُھلا کر کے کیسے رب کی رضا حاصل کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا تو نبی کریم ﷺ کے طریقوں پر چل کر ہی مل سکتی ہے، اور ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ نے رشتوں کو جوڑنے اور خلق خدا سے محبت اور ہمدردی کا ہی درس دیا ہے۔ اب بابا جان! آپ اپنے رب کو پا سکتے ہیں۔'' بولتے بولتے بہرام کا لہجہ بھرا گیا۔

''مجھے معاف کر دو، اپنے نادان باپ کو معاف کر دو۔'' بوڑھا نذیر روتے ہوئے اپنے بیٹے کے گلے لگ گیا۔

بیس سال بعد اپنی بیوی کے مرجھائے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر اور اپنے عمر رسیدہ والدین کے قدموں میں بیٹھ کر نذیر کو وہ سکون اور اطمینان دل میں اترتا محسوس ہو رہا تھا جس کے لیے اس نے اپنے بیس سال نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر گنوا دیے تھے۔ جو بات وہ بیس سالوں میں نہیں سمجھ سکا تھا وہ اس کے بیٹے نے اسے ایک سفر میں سمجھا دی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اپنے رب سے شرمندہ تھا، مگر اُسے اطمینان تھا کہ توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے۔

KID'S
Collection shoes

New Arrivals
Now At Store

ذوق وشوق
میگزین ساتھ لانے
پر اسپیشل
10%
ڈسکاؤنٹ

اسکول شوز ہر سائز میں ۔۔۔ چھ ماہ کی گارنٹی کے ساتھ ۔۔۔

Shop No. 9, Star Centre, Near Chawla Centre,
Main Tariq Road Karachi. Ph: 021-34315359

NEW OPENING
HAND BAGS
20% OFF

She shoes
Shoes for ladies and kids

New Arrivals
Now At Store

10% OFF
ON ALL DISPLAY
ITEMS
LIMITED TIME OFFER

SCHOOL SHOES & PT SHOES
AVAILABLE ONLY 790/=

FANCY CLUTCH
& WALLET

ذوق وشوق
میگزین ساتھ لانے
پر اسپیشل
10%
ڈسکاؤنٹ

Shop No. 14-15, Lavish Mall, Opp. Rabi center,
Main Tariq Road, Karachi. Tel.: 0213-4547778, 0213-34327331

کوپن برائے

بلا عنوان ۱۶۸

نام: _____ ولدیت: _____

مکمل پتا: _____

فون نمبر: _____

کوپن برائے

ذوقِ معلومات ۶۷

نام: _____ ولدیت: _____

مکمل پتا: _____

فون نمبر: _____

سوال آدھا ۲۳ جواب آدھا

نام: _____ ولدیت: _____

مکمل پتا: _____

فون نمبر: _____

کوپن برائے

قرآن کوئز ۱۲

نام: _____ ولدیت: _____

مکمل پتا: _____

فون نمبر: _____

مقابلۂ خوش خطی ۱۱

نام: _____ ولدیت: _____

مکمل پتا: _____

فون نمبر: _____

ہدایات: جوابات ۳۱، اگست ۲۰۲۱ء تک ہمیں موصول ہو جانے چاہییں..... ☆ ایک کوپن ایک ہی ساتھی کی طرف سے قبول کیا جائے گا.....

☆ کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے والے جوابات قرعہ اندازی میں شامل نہیں کیے جائیں گے۔

پیارے بچوں کے لیے
پیاری کتابیں
سچی دوستی
جنت کا دروازہ
چہکتی چڑیا
مسکراہٹ نگر
نئی کہانی نیا انداز
آؤ دوڑ لگائیں
صرف ایک عمل
سنت کہانی
مکتبہ بیت العلم
فدا منزل، نزد مقدس مسجد، اردو بازار کراچی۔
+92-312-3647578 ، +92-21-32726509
17 الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
+92-321-4361131 ، +92-42-37112356
ای میل: mbikhi.pk@gmail.com ، ویب سائٹ: www.mbi.com.pk

سلسلۂ

تحفۃ الدعاء

دعا عظیم نعمت اور انمول تحفہ ہے، دعا اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس سے راز و نیاز کا ذریعہ ہے، دعا مایوسی میں امید کی کرن ہے، دعا کے ذریعے ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام مسائل حل کروا سکتے ہیں، اس دنیا میں کوئی بھی انسان کسی بھی حال میں دعا سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

اسی فکر کے پیشِ نظر "مکتبہ بیت العلم" نے تحفۃ الدعا سیریز کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! اس سیریز کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں۔

MaktabaBaitulilm

بیت العلم

Karachi Ph : 021-32726509
Lahore Ph : 042-37112356
www.mbi.com.pk